روسی افسانے
مترجمہ
سعادت حسن منٹو
اورنگ زیب قاسمی
دارالادب پنجاب
بارود خانہ سٹریٹ لاہور

روسی افسانے

سعادت حسن منٹو

ناشر

دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ۔ لاہور

اورنگ زیب قاسمی

عبدالعزیز کاتب

اِنتساب

"فِکر احمر" کے نام

مقدمہ

روس کو مغربی تہذیب کا آخری بچہ کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک کی نسبت روس کی نشاۃ ثانیہ دو صدی بعد شروع ہوئی۔ تاہم روس نے ایسے ادیب اور مفکر پیدا کئے ہیں جن پر فکرِ انسان نازاں ہے۔ اُنیسویں صدی میں رُوسی مفکروں کی شہرت ماسکو سے نکل کر برلن، پیرس، لندن اور نیویارک تک جا پہنچی۔

اُنیسویں صدی کے آخری نصف میں روس میں دو ادبی دیو نمودار ہوئے۔ طالسطائی اور داستوفسکی کی شہرت مملکتِ زار سے نکل کر اکنافِ عالم میں پھیل گئی۔ دونوں زندگی، کردار، نفسیات اور انشا میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ تاہم دونوں کی تصانیف نے "ملتِ احمر" کے لئے بانگِ درا کا کام کیا۔ دونوں ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف مختلف راستوں سے گامزن تھے۔ دونوں کے افکار و آرا میں حیاتِ نو کی تڑپ موجود ہے دونوں کے ادبی کردار روس کی متحرک تصاویر ہیں۔

طالسطائی امیر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ لیکن داستوفسکی چشم و چراغ تھا، غریب خاندان کے لئے۔ زار کے ایوانِ عدل سے داستوفسکی کی موت کا فتویٰ صادر ہوا۔ لیکن بعد میں اُسے سائبریا بھیج دیا گیا۔ اُن مصائب نے داستوفسکی کو انسانی فطرت سے آشنا کر دیا۔

طالسطائی ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ قازان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ چند سال بعد وہ سینٹ پیٹرزبرگ میں دیکھا گیا۔ اُس کی آوارگی نے طالسطائی کے بھائی نکولس کو مجبور کر دیا۔ کہ وہ اُسے فوجی ملازمت کی ترغیب دے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں وہ کاکیشیا چلا گیا۔ سبزہ و گل کی کثرت حُسن کی سادگی اور کاکیشیا کی دہقانی دلچسپیوں نے نوجوان ذہن کی خوب تربیت کی۔ حُسن و عشق کی اِس سرزمین میں طالسطائی نے قلم اُٹھایا۔

۱۸۵۳ء میں وہ کریمیا گیا۔ جہاں تلواروں کے سایہ میں اُس نے "داستانِ سباستول" لکھی۔ ۱۸۶۰ء میں نکولس کی موت کے باعث اُسے واپس جانا پڑا۔ دو برس بعد اُس نے شادی کی۔ اِسی زمانہ میں "جنگ اور صلح" اور "اینا کرینا" شائع ہوئیں۔ ۱۸۷۰ء کے قریب اُس کے زاویہ نگاہ میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ اور آرٹ کی جگہ اخلاقیات نے لے لی۔

اُس نے دہقانی کی سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین شروع کی۔ مادی تمدن، ریاست، قانون، کلیسا اور ادب طالسطائیؔ کی نگاہوں میں انسانی فطرت کے منافی تھے۔ ۱۹۱۰ء میں وہ بے سرد سامانی کی حالت میں گھر سے نکل پڑا۔ لیکن بہت جلد وہ ایک غیر معروف ریلوے سٹیشن پر بے جان نظر آیا۔

روسی افسانوں کے اِس مختصر مجموعہ میں آپ طالسطائیؔ کے دو افسانے "شراب اور شیطان" اور "تین سوال" پائینگے۔

"شراب اور شیطان" میں طالسطائیؔ نے یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ جب انسان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ تو وہ صبر و سکون سے کام لیتا ہے۔ لیکن جونہی اُس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہوا۔ وہ فوراً گناہ اور عصیان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کسان اپنا کھانا گم ہونے پر بھی صبر و سکون کے دامن کو ہاتھ سے نہیں کھوتا۔ لیکن جب کسان کے پاس غلّہ کی کثرت ہو جاتی ہے۔ تو اُس کا کردار تبدیل ہو جاتا ہے۔ صبر و توکل والا کسان غصہ اور جوش کام میں لاتا ہے اِس کی سادگی، معصیت اور سیاہ کاری، کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہی شیطان جو غریب اور مفلس کسان کو گمراہ کرنے میں ناکام ہوا۔ کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ غلّہ جمع کر دیتا ہے۔ کسان اِس غلّہ کو غربا میں

تقسیم کرنے کی جگہ اِس سے شراب نکالتا ہے۔ اور اپنے دوست احباب کو مدعو کرتا ہے۔ شراب پینے کے بعد تمام مے نوش ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دکھائی دیتے ہیں۔

بوڑھا شیطان اپنے شاگرد سے دریافت کرتا ہے۔

"شراب کی ایجاد خوب رہی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم نے یہ شراب وحشیوں اور درندوں کے خون سے تیار کی ہے"

شاگرد جواب میں ترغیبِ گناہ کو اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"نہیں استاد! اِس میں درندوں وغیرہ کا خون نہیں۔ میرے لئے سب سے ضروری چیز یہ تھی۔ کہ کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہو۔ وحشیوں اور درندوں کا خون تو انسان میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ جب اُس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو تو وہ خون اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے"

طالسطائیؔ کا دوسرا افسانہ "تین سوال" ہیں۔ اِس افسانہ میں قدیم اخلاقی جھلک اور حقیقی طالسطاییت نظر آتی ہے۔

(۱) کسی کام کو شروع کرنے کا موزوں وقت کیا ہے؟

(۲) کن اشخاص سے صحبت رکھنی چاہیئے؟

(۳) دنیا میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری کام کیا ہے؟

طاسسطائی اِن سوالوں کا جواب اِس طرح دیتا ہے:۔

"کسی خاص کام کے لئے صرف ایک ہی موزوں ہوا کرتا ہے جبکہ ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے۔ کہ ہم اُسے سرانجام دے سکیں"

"سب سے زیادہ ضروری شخص وہی ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ تم اِس وقت موجود ہو۔ کیونکہ اِس بات کا معلوم کرنا کہ اِس شخص کے سوا تمہیں کسی اور سے بھی واسطہ پڑیگا۔ انسان کے فہم وقیاس سے بالا ہے" "سب سے ضروری اور اہم کام اُس شخص سے نیکی کرنا ہے۔ کیونکہ خدا نے انسان کو صرف اِسی غرض کے لئے دنیا میں بھیجا ہے"

جنگ کریمیا کے بعد روس میں اصلاحات کا مختصر زمانہ رہا۔ ۱۸۱۸ء کے بعد وہی حالت ہو گئی۔ جو الگزینڈر ثانی سے قبل تھی" آزاد خیال" جماعت کے حوصلے پست ہو گئے۔ انہیں ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا ایسا

معلوم ہوتا تھا۔ جیسے شمعِ حریت کے گل ہونے سے ملتِ روسیہ تاریکی میں چھوڑ دی گئی ہو۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ طاسسطائی رجائیت کو خیرباد کہتا ہوا یاس وقنوط میں پناہ لیتا ہے۔ اِسی زمانہ کی بہترین تصویر گارشن اور چیخوف کے افسانوں اور نادسن کے اشعار میں نظر آتی ہے۔

چیخوف ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوا۔ ماسکو یونیورسٹی سے طِب کی اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد اِس نے ادبی زندگی شروع کی۔ وہ ابتدا میں مختصر وکاہی قلمی چہرے" مختلف جرائد میں اشاعت کے لئے بھیجتا رہا۔ آہستہ آہستہ اُس نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ افسانوں میں مذاحیہ رنگ یک قلم غائب نظر آتا ہے۔ چیخوف کی زندگی پرسکون اور خاموش تھی۔ آخری عمر میں اِس نے ڈرامہ کی طرف بھی توجہ کی۔ ۱۹۰۴ء میں چیخوف اِس جہان سے چل بسا۔

چیخوف کے زمانہ میں روس کی اخلاقی حالت بہت پست تھی سیاسی طور پر بھی روس میں آزادی کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ جب گردوپیش یہ حالات ہوں تو چیخوف کے بربطِ فکر سے سوائے المیہ نغموں کے اور کونسی صدا اُٹھ سکتی تھی۔

چیخوف کے مختصر افسانے روسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اُس کے کردار روزمرہ زندگی کے انسان نظر آتے ہیں۔ اسکا تخیل شاعرانہ مغالطہ سے پاک ہے۔

۱۸۶۰ء میں ڈارون اور علم الابدان کا چرچا تھا۔ لیکن دس برس بعد مارکس اور اشتمالیت کا تذکرہ ہوا۔ روس کے ادبی حلقوں میں مارکس نے شمع ہدائت کا کام کیا۔

کیا چیخوف معلم اخلاقیات تھا؟

نہیں! بلکہ وہ آرٹسٹ تھا۔

وہ زندگی کو اس طرح پیش کرتا۔ جس طرح وہ اُسے خود دیکھتا۔ وہ اِس چنگاری کو جو انسانی سرشت میں پنہاں ہے۔ شعلہ بنانے کی کوشش کرتا۔ وہ ہمیشہ اِس امر کی تعلیم دیتا۔ کہ زندگی کی موجودہ مصیبتیں رُو بہ تغیر ہیں۔ دنیا اِس قابل ضرور ہے۔ کہ ہم اُس میں رہیں —— اپنے لئے نہ سہی بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے۔ چیخوف کا خیال تھا۔ کہ چند صدی بعد دنیا مسرت و راحت سے لبریز ہوگی۔

ردِّعمل کے اِسی زمانہ میں حال سے مایوس اور مستقبل سے پُر اُمید

فلسفی اور مفکر پیدا ہوئے۔ اِن لوگوں نے حال کے مصائب کو اِس انداز میں کیا۔ کہ اُن میں سے بعض جلاوطن کر دیے گئے۔

"خادمہ" میں چیخوف ایک روسی خادمہ وارکا کی داستانِ غم بیان کرتا ہے۔ وارکا ایک تیرہ سالہ لڑکی ہے۔ جس سے دن بھر کام لیا جاتا ہے

"وارکا انگیٹھی میں کوئلے ڈالو

وارکا سماوار گرم کرو

وارکا اپنے آقا کے بڑے بوٹ صاف کرو

وارکا سیڑھیوں کو دھو ڈالو

وارکا تین بوتلیں شراب کی لاؤ

وارکا گلاس صاف کرو

وارکا کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ دن بھر شیر خوار بچہ کو لوری دینا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وارکا کی مالکہ نے اُس کی نیند بھی خرید لی تھی۔

"وارکا اپنے آقا کے بڑے بوٹ صاف کرنے کے لئے فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سوچتی ہے۔ کہ کیا ہی اچھا ہو۔ اگر وہ اُس بڑے بوٹ میں سر ڈال کر تھوڑا سا آرام کرے۔

لیکن مالکہ کا یہ حکم کہ بچّہ کو لوری دو اُسے ایک لمحہ بھی آرام کرنے نہیں دیتا
آخر کار انسان کی سرشت میں بغاوت کی جو چنگاری ہے۔ وہ بھڑک اُٹھتی ہے
وارکا اپنی زندگی پر غور کرتی ہے۔ وہ مصیبت کے سرچشمہ کو ہمیشہ کے لئے
بند کرنا چاہتی ہے۔

"وہ اُس طاقت کو جس نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے
ہیں۔ جو اس کی چھاتی پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ جو اسے زندہ نہیں
رہنے دیتا، نہیں سمجھ سکتی۔

اسی طاقت کی جستجو کے لئے اپنے ارد گرد نظر دوڑاتی ہے۔ تاکہ
اُس کی گرفت سے آزاد ہو سکے۔ مگر بے سود۔ روشنی کے رقصاں
دھبوں اور کپڑوں کے متحرک سائے پر نظر دوڑانے کے بعد
وہ اس دشمن کو پالیتی ہے۔ جو اُس کی زندگی میں سدِ راہ ہو رہا ہے
وہ دشمن کون تھا؟ وہی بچّہ جسے سُلانے کے لئے "سو جاؤ میرے ننھے
سو جاؤ" کہتے کہتے وارکا کی زبان تھک جاتی اب یہ الفاظ زبان پر آتی ہے
"بچّے کی موت کے بعد نیند ——— نیند ——— نیند"
وہ نیند کے لئے بچّہ کو ہلاک کرتی ہے۔ لیکن اُسے صرف موت کی ابدی

نیند حاصل ہو سکتی۔
ہر وہ چیز جو انسان کے لئے تکلیف دہ ہو۔ اُسے ختم کر دینا چاہئے۔ خواہ
اُس کے ختم کرنے میں جان تک بھی قربان کرنی پڑے۔
چیخوف کا دوسرا افسانہ "ایشار" ہے۔ اس میں اُس نے معمولی واقعہ
سے ثابت کیا ہے۔ کہ کائنات کا انحصار محبت اور صرف محبت پر ہو سکتا ہے

"محبت ——— موت اور اُس کی ہیبت سے کہیں زیادہ
ہے۔ اور صرف محبت ہی ایسی چیز ہے۔ جو زندگی کے نظام
کو قائم اور متحرک رکھتی ہے"

اس افسانہ میں چیخوف کی نسبت طالسطائی کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔
اُنیسویں صدی کا آخری نصف صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ دہقانی
اشتراکیت کا خیال روسی اذہان سے بتدریج محو ہو رہا تھا۔ کسانوں کی جگہ کارخانوں
میں کام کرنے والے مزدوروں نے حاصل کر لی۔ روسی افسانہ نگاری کی توجہ
کسان سے منعطف ہو کر مزدور کی زبوں حالی اور واژگوں بختی میں مرکوز ہو گئی
کارل مارکس کے افکار نے روس کی قدیم "حزبی اشتراکیت" کا خاتمہ کر دیا
اس زمانہ کے گلستانِ ادب میں گورکی نے بادِ نسیم کا کام کیا۔ شباب

مستقل مزاجی اور فکر جدید کیساتھ گورکی روس کے ایوانِ ادب میں داخل ہوا۔ــ شاید کرسئی صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے لیئے ـــــــــ

گورکی کے افسانوں نے ایک جدید خیالستان کی طرح ڈالی۔ گورکی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوا۔ اُس کی پیدائش کے چند روز بعد گورکی کا والد انتقال کرجاتا ہے۔ اُس کی پرورش اُس کے دادا کے سپرد ہوئی۔ مستقبل کا مفکر کفش دوز کی دکان سے بھاگ کر ایک جہاز میں ملازم ہونے کے بعد نانبائی کے ہاں پناہ لیتا ہے۔ قدرت کو یہ مقصود نہ تھا۔ کہ گورکی کفش دوزی کرے۔ بلکہ وہ حکمت کے ایسے خیمے تیار کرے۔ جو سقف نیلوفری کے نیچے "ادبی جنت" کا کام دیں۔

گورکی کا ذہنی تلاطم اُسے روس کی سرحدوں پر لیئے پھرا۔ وہ خانہ بدوش سیاحوں میں شامل ہوکر بحیرۂ آسود تک جا پہنچا۔ ۱۸۹۲ء میں اِس مقام پر اُس کی پہلی تصنیف "سیاحت" شائع ہوئی۔ چند مزید تصانیف کے بعد گورکی کی شہرت تمام روس میں پھیل گئی۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصّہ لینے کے باعث اُسے سرزمین روس کو خیرباد کہنا پڑا۔ روس چھوڑنے کے بعد اُسنے میزینی اور گیری بالڈی کے

وطن میں اقامت اختیار کی۔ ۱۹۱۷ء میں زاریت کے خاتمہ کے بعد گورکی روس میں دوبارہ داخل ہوا۔ گورکی کا قلم اِس وقت مخالف قوتوں کے خلاف مصروف پیکار ہے۔ اشتراکی روس میں لینن کے بعد گورکی قابل احترام شخصیت ہے۔ جس طرح انیسویں صدی میں ہیوگو کے افکار نے نوجوان قلوب پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اُسی طرح بیسویں صدی کا نوجوان گورکی کے افکار و آرا اور فلسفۂ حیات سے مسخر ہو چکا ہے۔ "دو مزدور کی شکست" میں ہم اپنے تیئں ایک تنگ و تار غار میں پاتے ہیں۔ جہاں صبح سے شام تک نانبائی کام کرتے ہیں۔ روزمرّہ کی تکلیف دہ زندگی اور شدت ان چھبیس ۲۶ متحرک مشینوں کو انسانیت کے دائرہ سے خارج کر دیتی ہے اگر اُن کا تلخ جام حیات کسی کی مستی بھری آنکھوں سے آب زندگی میں تبدیل نہ ہوتا۔ اُن کی زندگی حیوانوں سے بدتر ہوتی۔ اگر مضرابِ حُسن اُن کے سازِ حیات سے ہر روز نہ ٹکراتی۔ وہ سب کے سب محض میکانی انسان ہوتے اگر تانیا اُن کے خوابیدہ جذباتِ الفت کو اپنی حسین نگاہوں سے بیدار نہ کرتی۔ وہ مٹی کے بُت ہوتے اگر وہ اُن سے ہم کلام نہ ہوتی ــــ اِن کی محفلِ حزن میں ابدی سکوت طاری رہتا۔ مگر روسی دوشیزہ اُن سے جدا

کر دی جاتی ہے ۔ وہ ظالم آقا کے جور و ستم سے بے حس حیوان تھے ۔ لیکن ناآشنا
کے درسِ الفت نے انہیں انسانیت سے آشنا کر دیا۔

ایک آوارہ مزاج اور اوباش اِن چھبیس مزدوروں کے سامنے نمودار
ہوتا ہے ۔ یہ خوش گل اور خوش پوش مگر بدکردار انسان دعویٰ کرتا ہے ۔ کہ
کوئی حسینہ اُس کے دام فریب میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چھبیس
بے کس انسان اپنی مشترکہ محبوبہ کی اخلاقی جرأت پر اعتبار کئے ہوئے تھے،
اعتماد نے انہیں دھوکہ دیا۔ ایک وضع دار اُن کی اُمیدوں کے مرکز کو مٹا
کر اُن کا دائرہ حیات تنگ کر دیتا ہے ۔ شمع اُمید گل ہونے کے بعد وہ پھر
تاریکی میں نظر آتے ہیں ۔ اِس افسانہ سے گورکی کا شاید یہ مقصد ہو کہ کس
طرح ایک پاک اور متبرک جذبہ ناہنجار لوگوں کی مداخلت سے ناپاک اور
اور غیر متبرک صورت اختیار کر لیتا ہے ۔

جس بھٹی میں دن بھر چھبیس مزدور کام کرتے اُسے گورکی اِن الفاظ
میں بیان کرتا ہے :۔

صبح سے لے کر شام تک آتشکدہ کی طرف دیکھتی رہتی جس
کی سرخ شعاؤں کا عکس دیوار پر اِس طرح رقص کرتا معلوم

ہوتا۔ جیسے وہ ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش ہنسی ہنس رہا ہو
وہ بھٹی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی ۔ جو اپنے بڑے
حلق سے آگ اُگل رہا ہو، ہمارے سامنے جہنم کی جھلسا دینے
والی گرمی ایسے سانس لے رہا ہو ۔ اور ہمارے غیر مختتم کام کو
اپنی پیشانی کے دو سیاہ و تاریک سوراخوں سے مطالعہ کر
رہا ہو۔ یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے ——
آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی اور رحمدلی کے
جذبہ سے عاری ہوں ۔

یہ آنکھیں ہمیشہ تاریک نظر سے دیکھتیں ۔ جیسے وہ اپنے غلاموں
کو دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئی ہوں ، اور اِس بات کی توقع چھوڑ
دی ہو کہ ہم جنسِ آدم میں سے ہیں ۔

اقبالؔ بلبلِ شوریدہ کے نالہ کو خام قرار دیتا ہوا ۔ اُسے اپنے سینہ میں
رکھنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ لیکن روسی مفکر خاموشی پر اِس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے
"خاموشی اُن اشخاص کے لئے جو سب کہہ چکے ہوں ۔ اور کچھ
کہنے کے لئے باقی نہ رکھتے ہوں ۔ خوف اور اذیت ہے ۔ مگر

اُن کے لئے جو ابھی تک اپنی آواز سے ہی ناآشنا ہوں۔ خاموشی
بجائے تکلیف دہ ہونے کے آسان اور راحت رساں ہے،
چھبیس مزدوروں کی حالت بیان کرتا ہوا لکھتا ہے

"اسی دوران میں آگ کے شعلے بھٹی میں سُرخ زبانیں
نکال رہے ہوتے، نانبائی کی آہنی سلاخ بھٹی کی زرد
اینٹوں پر تیز آواز کھیل رہی ہوتی، اُبلتا ہوا پانی بدستور
جاری رہتا۔ اور شعلوں کا عکس دیوار پر رقصاں خاموش
ہنسی ہنس رہا ہوتا ——— اور ہم کسی غیر
کے لفظوں میں اُن انسانوں کا دکھ درد بیان کرنے میں
مصروف ہوتے جن سے سورج کی روشنی چھین لی گئی ہو —
جو غلام ہوں ——— یہ تھی ہماری زندگی ———
چھبیس غلاموں کی زندگی اِس قفس میں جس میں زندگی
کے ایام اِس قدر تلخ گذر رہے تھے۔ کہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ
سنگین مکان کی ——— منزلیں ہمارے کندھوں پر تعمیر
کی گئی ہیں"

انسان کے دل میں حسن کے احترام کے جذبات ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔

"ہر حسین چیز انسان کے دل میں وقعت اور عزت پیدا کر دیتی
ہے ——— خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی
کیوں نہ ہو"

گورکی ادبیات روس میں ہر روز نمایاں اضافہ کر رہا تھا
جہاں تک پروازِ تخیل کا تعلق ہے۔ انڈریف کے بعد سلوگب کا درجہ ہے
سلوگب ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے اپنی نظموں کا
مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۰۵ء میں "خورد سال شیطان" شائع ہوئی۔ اس وقت
تک سلوگب متعدد ناول، ڈرامے اور افسانے لکھ چکا ہے۔ مختصر افسانہ
نگاری میں وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔

اقبال پیام مشرق میں: ابدی جدوجہدِ حیات اور سرمدی تنازع للبقا کو
واضح کرتا ہے ؎

بطے می گفت بحر آزاد گردید
چنین فرمان ز دیوانِ خضر رفت
نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی

وے از ما نبائید بجز رفت

سلوگب "مساوات"، میں یہی خیالات پیش کرتا ہے

"پتھر کی سرگزشت" میں سلوگب شائد یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ قوت ارادی سے انسان منزلِ مقصود پر پہنچ کر جب مقصدِ حیات سے غافل ہو جاتا ہے۔ تو مخالف قوتیں اُسے پسپا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں غفلت انسان کے لئے پیغام مرگ ہے ؎

گر بقدر یک نفس غافل شدی
دور صد فرہنگ از منزل شدی

(اقبال)

چریکوف بونن کی طرح حیاتِ انسانی کا عمیق ناظر ہے۔ اُس کے افسانوں میں تازگی اور مسرت کے باوجود غم کی لطیف جھلک نظر آتی ہے "جادوگر"، میں مزدوروں کی ہڑتال کا منظر پیش کرنے کے بعد ایک بچے کی نفسیات بیان کی گئی ہیں۔ جو اپنی ماں سے دریافت کرتا ہوا - مزدوروں کی حمائت کرنا چاہتا ہے۔ مگر ماں اُسے زیادہ گفتگو کا موقع نہیں دیتی۔ ماں اور بچہ مارے خوف کے ایک گاڑی میں سوار ہو جاتے

ہیں۔ کوچوان اور مادام کی گفتگو سے ننھا سرگ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ کہ مزدور اچھے ہیں یا بُرے۔

کوچوان اور آگنیش کا کردار انقلاب کی فطری خواہش کا آئینہ دار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ روس کا ہر متنفس تبدیلی کا خواہاں ہے۔

دو روز بعد ہڑتال بالکل عام ہو گئی۔ اشیاء خوردنی تک بھی مہیا نہ ہو سکتی تھیں۔ سرگ کو صبح کے وقت بسکٹ نہ ملے۔ تو اُس کے دماغ میں مزدوروں کے خلاف حقارت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے تاہم وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ مزدور اچھے ہیں یا بُرے ـــــ وہ مزدوروں سے خوفزدہ ضرور تھا۔

جب سرگ کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس کی خادمہ کا خاوند مزدور ہے۔ تو وہ مزدور کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ وہ مزدور جس نے شہری آبادی پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ کس قدر خوفناک اور بہادر ہوگا؟ لیکن اکیلے مزدور کی زبون حالی دیکھنے کے بعد بچے کے دل سے مزدوروں کا خوف زائل ہو گیا

مزدور کی اجتماعی قوت ایوانِ حکومت کو متزلزل کر سکتی ہے۔

لیکن ننھا مزدور ایک خوفزدہ بچے کو بھی مرعوب نہ کر سکا۔

کسی ملک کا آرٹ اور لٹریچر اُس کی رفتار حیات کا مظہر ہوا کرتا ہے جس طرح زندگی صنعتی، سیاسی اور مجلسی انقلابات سے گذرتی ہے۔ اُسی طرح ادب متوازی مدارج طے کرتا ہے۔ روس ایسی زراعتی سر زمین کے اچانک صنعتی ملک ہو جانے سے وہاں سینکڑوں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ قدیم نظریئے ختم کر دئے گئے ——— زاری و قیصری، سروری و سکندری کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ ادبیات میں طالسطائیت کی خشک اخلاقیات کی جگہ گورکی کے جان آفرین اور حریت پرور افکار نے حاصل کی۔ مذہب، کلیسا اور عبادت کی جگہ اشتمالیت، کارخانہ اور محنت نے لی۔

"روسی افسانوں" کے مترجم سعادت حسن اِس سے پیشتر شہرۂ آفاق فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو کی کتاب کا ترجمہ "سرگذشت اسیر" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے متعلق ہندوستان کے بہترین ادبی رسائل و جرائد نے نوجوان مترجم کی خدمت میں

خراجِ تحسین پیش کیا۔

روسی "افسانوں" میں "مساوات"، "پتھر کی سرگذشت"، "جاگیردار"، "شراب اور شیطان" ہندوستان کے ممتاز ادبی رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہو چکے ہیں

"سرگذشت اسیر" کی طرح مترجم نے شوکتِ ترکیب، تسلسل، زورِ بیان اور روانی کو ترجمہ میں بدستور جاری رکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

روسی ادب کے مطالعہ کے بعد مترجم نے روسی طرز کا ایک مختصر "طبعزاد" افسانہ "تماشا" لکھا ہے۔ افسانہ کا محلِ وقوع امرتسر کی جگہ ماسکو نظر آتا ہے

خالد نقاب پوش ہندوستانی خاتون کا بچہ ہونے کی نسبت سرخ دامن کا پروردہ دکھائی دیتا ہے:

باری

"دارالاحمر"۔ امرتسر۔

۲۳۔ اپریل ۱۹۳۴ء

سپاہی اور موت

"افانسیف"

سپاہی اور موت

پچیس سالہ خدمات کے دوران میں سپاہی کے برخلاف افسرانِ بالا کو کبھی شکائت کا موقع نہ ملا تھا۔ اس نے اپنی خدمات بڑی تن دہی اور جانفشانی سے سرانجام دی تھیں۔ لیکن جب اس نے چاہا۔ کہ نوکری سے مستعفی ہو کر زندگی کے بقایا ایام آرام سے گزارے۔ تو افسرانِ بالا نے اس کی درخواست رد کر دی۔

" میں خدا اور زار کی پورے پچیس سال خدمت بجا لایا ہوں اور اس دوران میں میرے متعلق کبھی شکائت کا موقع نہیں ملا —— مگر اب جب کہ میں چاہتا ہوں۔ کہ چند دن آرام سے گزاروں۔ تو اُنہوں نے میری درخواست مسترد کر دی ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے۔ کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے بھاگ نکلوں۔" سپاہی نے بڑی سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا۔

چنانچہ وہ ایک دن بھاگ نکلا۔ تین دن کی بھاگم بھاگ کے بعد اُسے راستے میں خدا ملا۔

"کیوں میاں سپاہی؟ کہاں جا رہے ہو؟" خدا نے سپاہی سے دریافت کیا۔ "میرے مالک! میں پورے پچیس سال اپنی خدمات ایماندارنہ بجالایا ہوں۔ مگر اب وہ میرا استعفےٰ قبول نہیں کرتے۔ اِس لئے میں اُن سے بھاگ رہا ہوں"

"جب تم نے پچیس سال تک اپنی خدمات بطریق احسن سرانجام دی ہیں۔ تو آؤ! تمہیں اجازت ہے۔ کہ میری بادشاہت میں داخل ہو جاؤ ——— بہشت کے دروازے تم پر کھلے ہیں"

چنانچہ بہشت کے دروازے کھل گئے۔ سپاہی اندر داخل ہو گیا بہشت کی لطیف فضا اور پرکیف مناظر کو دیکھ کر دل میں کہنے لگا "زندگی اِسی کا نام ہے"

باغوں میں ٹہلتا ہوا فرشتوں کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا "کیا آپ مجھے تمباکو بیچنے والے کی دکان بتا سکتے ہیں؟"

"کونسا تمباکو؟ ——— میاں! تم اِس وقت فوج میں نہیں ہو ——— یہ بہشت ہے ——— خدا کی بادشاہت میں تمباکو کہاں؟"

سپاہی چپ ہو گیا ——— مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر اُن فرشتوں کے پاس گیا اور کہنے لگا "تو پھر یہی بتلا دیجئے شراب کہاں ملتی ہے؟"

"او خاکی پتلے ——— تیرا ابھی تک یہی خیال ہے۔ کہ تو فوج میں ہے۔ بہشت میں شراب کہاں؟"

"یہ بہشت کس طرح ہو سکتا ہے۔ جہاں شراب اور تمباکو ہی نہیں ملتا" یہ کہ کر وہ بہشت سے باہر چلا گیا ——— وہ ایسی جگہ رہنے کو تیار نہ تھا۔ جہاں شراب اور تمباکو نہ ملے۔ زمین پر وہ بہت عرصہ تک چلتا رہا۔ حتےٰ کہ اُس کی خدا سے پھر ملاقات ہو گئی۔

"یہ بہشت کیسی جگہ ہے۔ میرے خدا؟ ——— جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔ وہاں تو تمباکو اور شراب ہی نہیں ملتی"

"بہت اچھا! ——— اپنے داہنے ہاتھ کو چلے جاؤ۔ تمہیں وہاں ہر ایک شے مل جائے گی"

وہ اپنے داہنے ہاتھ کی طرف چل پڑا ——— راستے میں اُسے بدروح ملی۔

"میاں سپاہی! کسے ڈھونڈھ رہے ہو؟"

"پہلے مجھے کسی جگہ لے چلو ——— تاکہ اطمینان سے گفتگو ہو سکے"

"چنانچہ سپاہی کو وہ ناپاک روح ایک گرم جگہ لے گئی۔

"آپ کے ہاں تمباکو ہے کیا؟" سپاہی نے ناپاک روح سے دریافت کیا۔

"ہے! میرے اچھے سپاہی"

"شراب بھی؟"

"شراب بھی"

"تو لاؤ ——— دونوں چیزیں لاؤ"

چشم زدن میں اُس ناپاک روح نے دونوں چیزیں حاضر کردیں جب سپاہی کو دونوں چیزیں مل گئیں۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور کہنے لگا بہشت یہی ہے"

لیکن جب وہ گھومنے کے لئے باہر نکلا۔ تو اُسے بہت سی ناپاک روحیں نظر پڑیں۔ جن کی شکلیں دیکھ کر وہ بہت گھبرا گیا ——— چند دنوں کے بعد اس قدر اداس ہوا۔ کہ سوچنے لگا۔ کیا کرے"

اچانک ایک روز اُس کے دماغ میں ایک عجیب خیال آیا۔ لکڑی کا ایک گز بنا کر زمین ماپنے لگا۔ کہ شیطان دوڑتا ہوا آیا۔ اور پوچھنے لگا "کیا کر رہے ہو میاں سپاہی" "کیا اندھے ہو؟ دیکھ نہیں رہے ہیں یہاں معبد بنانے لگا ہوں"

شیطان دوڑتا ہوا اپنے بوڑھے دادا کے پاس گیا۔ اور چلا کر کہنے لگا "محترم دادا! ہم تباہ ہوگئے ——— یہ انسان یہاں معبد بنانے لگا ہے"

یہ سن کر بوڑھا شیطان غصّہ سے تھر تھر کانپتا ہوا۔ خدا کے حضور میں گیا۔ اور کہنے لگا۔ "خداوندا آپ نے ہمارے پاس کس قسم کا انسان بھیجا ہے۔ جو ہماری جگہ پر معبد بنانا چاہتا ہے"

"اس میں میرا قصور؟ ——— تم نے ایسے انسان کو اپنی جگہ میں داخل ہی کیوں کیا؟"

"خداوندا کسی نہ کسی طرح اس سپاہی کو واپس بلا لیجیے"

"میں اُسے کس طرح بلا لوں۔ وہ تو خود چاہتا تھا۔ کہ تمہارے پاس جائے"

"آہ! اب ہم ناچیز کیا تدبیر عمل میں لائیں" بوڑھے شیطان نے روتے ہوئے کہا۔ خدا نے بارعب لہجہ میں جواب دیا "جاؤ! کسی نوجوان شیطان کی کھال اتار کر اُس کا ڈھول بناؤ۔ اِس ڈھول کی آواز ہی اس سپاہی کو وہاں سے دور کر سکتی ہے" بوڑھے شیطان نے آتے ہی ایک نوجوان شیطان کو پکڑا اور اُس کی کھال اتار کر ایک ڈھول پر منڈھ لی۔ سب کچھ تیار کر کے اُس نے تمام شیطانوں کو اکٹھا کر کے حکم دیا۔

"دیکھو! جونہی یہ سپاہی اِس جگہ سے بھاگے۔ تم تمام دروازے بند کر لو تاکہ وہ پھر یہاں نہ آسکے"

یہ کہہ کر اُس نے ڈھول پر ضربیں لگانی شروع کیں۔ ڈھول کی آواز سن کر سپاہی اِس جگہ سے اُٹھ دوڑا ——— جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

جونہی وہ دروازہ سے باہر نکلا۔ شیطانوں نے تمام دروازے بند کر لئے۔

سپاہی نے جب دیکھا۔ کہ دروازے بند ہیں۔ تو دستک دینی شروع کی "دروازہ کھول دو۔ ورنہ دیوار پھوڑ کر اندر آجاؤں گا"

"تم ایسا نہیں کر سکتے میرے بھائی! ہم تم سے کہیں طاقتور ہیں"

شیطانوں نے جواب دیا۔

جب سپاہی نے دیکھا۔ کہ اب اُس کا کوئی بس نہیں چلتا تو سر لٹکا کر پھر زمین پر چلنا شروع کر دیا۔ دو تین دن کی آوارہ گردی کے بعد اُسے پھر خدا ملا۔

"میاں سپاہی! کہاں جا رہے ہو" خدا نے دریافت کیا

"مجھے خود علم نہیں"

"تو اب بتاؤ کہاں جانا چاہتے ہو ——— بہشت میں بھیجا تو وہ تمہیں پسند نہ آیا، دوزخ میں گئے۔ تو وہاں تم رہ نہ سکے۔ اب کہاں جانے کی خواہش ہے؟"

"میرے خدا! مجھے اپنے دربار کا محافظ بنا لے"

"بہت اچھا"

چنانچہ خدا نے اُسے اپنے محل کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ اور کہا دیکھو خیال رہے کوئی شخص اندر نہ آنے پائے"

"بوڑھے سپاہی کو آپ کیا سکھلا رہے ہیں ——— آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی"

سپاہی بہت عرصہ تک دروازہ پر پہرہ دیتا رہا اور کسی کو اندر نہ جانے دیا۔ آخر ایک دن کے بعد "موت" آئی

،، کون گزر رہا ہے ،، سپاہی نے کڑک کر پوچھا ،،

،، موت ،،

،، کس کے پاس جا رہی ہو ،،

،، خدا کے پاس ،،

،، کس لئے ،،

،، حکم لینے کے لئے کہ اب کن اشخاص کی جانیں قبض کروں ،،

،، تو تھوڑی دیر کے لئے انتظار کرو۔ میں خدا سے اجازت لے آؤں ،،

،، خداوندا موت دروازے پر کھڑی آپ کے احکام کی منتظر ہے"

،، جاؤ اسے حکم دو۔ کہ آئندہ تین سال تک وہ بوڑھے انسانوں کو ہلاک کرتی رہے۔ یہ سن کر سپاہی نے خیال کیا۔ کہ اِس طرح تو اُس کے بوڑھے والدین بھی ہلاک ہو جائیں گے۔ اِس لئے موت کے پاس آ کر کہا ،، خدا نے تمہیں حکم دیا ہے۔ کہ جنگلوں میں جا کر تین سال تک

پُرانے اور بوڑھے درختوں کو اکھیڑتی رہو ،،

موت یہ حکم سن کر رو پڑی۔ اور کہنے لگی ،، خداوند میرے ساتھ ناراض ہیں۔ جو مجھے ایسی سزا دے رہے ہیں ،،

یہ کہتی ہوئی موت جنگلوں میں چلی گئی۔ اور تین سال تک سال خوردہ درختوں کو ہلاک کرتی رہی۔ تین سال کے بعد تھکی ہوئی پھر خدا کے حضور میں نئے احکام لینے کی خاطر حاضر ہوئی

،، تم پھر آ گئی ہو ،، سپاہی نے موت سے دریافت کیا ،،

،، خدا سے احکام لینے کے لئے ،،

،، تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرو۔ میں خدا سے اجازت لے آؤں ،،

چنانچہ سپاہی خدا کے حضور میں گیا۔ اور مؤدبانہ پوچھا ،، حضور موت نئے احکام لینے کی خاطر دروازے پر کھڑی ہے ،،

،، جاؤ اُسے کہہ دو کہ تین سال تک نوجوان انسانوں کو ہلاک کرتی رہے ،،

یہ حکم سن کر سپاہی نے سوچا۔ کہ اس طرح تو اُس کے تین بھائی مر جائیں گے۔ اِس لئے موت کے پاس آ کر کہنے لگا ،، خدا نے تمہیں

حکم دیا ہے۔ کہ جنگلوں میں جا کر تین سال تک جوان درختوں کو ہلاک کرتی رہو،،

موت رو پڑی اور سسکیاں لیتے ہوئے کہنے لگی ،، میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے۔ جو خدا مجھے ایسی سخت سزا دے رہا ہے ،،

یہ کہ کر وہ پھر جنگلوں میں چلی گئی۔ اور تین سال تک جوان اور سر سبز درختوں کو اکھیڑتی رہی۔ تین سال کے بعد اپنے آپ کو بمشکل گھسیٹتی ہوئی پھر خدا کے حضور میں نئے احکام لینے کی خاطر آئی ،،

”کہاں جا رہی ہو؟،، سپاہی نے موت سے دریافت کیا ،،

”خدا کے پاس۔ دریافت کرنے کہ اب کن اشخاص کو ہلاک کروں“

”تو تھوڑی دیر کے لئے یہاں انتظار کرو ——— میں ابھی اجازت لے کر آیا ،،

چنانچہ وہ ایک دفعہ پھر خدا کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا ”خداوند! موت پھر نئے احکام لینے کی خاطر حاضرِ خدمت ہوئی ہے ،،

”جاؤ! اُسے کہ دو کہ وہ تین سال تک چھوٹے بچوں کو ہلاک کرتی رہے ،،

سپاہی نے خیال کیا کہ اُس کے تین بچے ہیں۔ اِس طرح تو وہ بھی مر جائیں گے۔ اِس لئے موت کے پاس آیا اور کہا ”خدا نے حکم دیا ہے۔ کہ جنگلوں میں پھر واپس جاؤ اور تین سال تک چھوٹے پودوں کو ہلاک کرتی رہو۔،،

یہ سن کر موت زار و قطار رونے لگ گئی میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے۔ جس کی سزا بھگت رہی ہوں ،،

یہ کہ کر وہ پھر جنگلوں میں چلی گئی۔ اور تین سال تک چھوٹے پودوں کو ضائع کرتی رہی۔ تین سال کے بعد لنگڑاتی ہوئی پھر خدا کے حضور میں آئی اور دل میں عہد کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو۔ اِس دفعہ خود خدا کے پاس جاؤں گی۔ اور دریافت کروں گی۔ کہ خدا نے اُسے کیوں نو سال تک اتنی سخت سزا دی ،،

” سپاہی نے موت کو سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ تو کہنے لگا ”کہاں جا رہی ہو،، موت نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور سیڑھیوں پر چڑھتی گئی۔ جب سپاہی نے دیکھا موت کچھ جواب نہیں دیتی۔ تو اُس نے موت کو گردن سے پکڑ لیا۔ اور خدا کے دربار میں نہ جانے

دیا۔ موت بہت چیخی چلائی۔ اُدھر سپاہی نے بھی خوب شور مچایا۔ خدا یہ
شور سن کر باہر آ گیا۔ اور کہنے لگا" یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے ؟"

"خداوند! آپ میرے ساتھ اس قدر ناراض کیوں ہیں ؟ میں پورے
نو سال تک جنگلوں میں سر پٹکتی رہی ہوں۔ تین سال تک سال خوردہ
درخت اکھیڑتی رہی، تین سال تک جوان اور سرسبز درختوں کو ہلاک کرتی
رہی اور اسی عرصہ تک پودوں کو ضائع کرتی رہی —— آخر ایسی
سزا کس گناہ کی پاداش میں ؟"

یہ سن کر خدا نے سپاہی کی طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھتے
ہوئے کہا" یہ سب شرارتیں تمہاری معلوم ہوتی ہیں "

" میں معافی چاہتا ہوں —— خداوند" سپاہی نے تھر تھر
کانپتے ہوئے کہا

" تمہیں سزا دی جاتی ہے۔ کہ موت کو نو سال تک اپنے کندھوں
پر اُٹھائے پھرو"

حکم ملنا تھا۔ کہ موت سپاہی کے کندھوں پر چڑھ بیٹھی۔ اور
سپاہی اُسے اُٹھائے چل پڑا۔ وہ بہت عرصہ تک موت کو اسی طرح

اُٹھائے چلتا رہا۔ مگر آخر کار تھک کر چور ہو گیا۔ اور جیب سے نسوار کی
ڈبیا نکال کر سونگھنے لگا۔

موت نے دیکھا کہ سپاہی کچھ سونگھ رہا ہے۔ حیران ہو کر کہنے
لگی" میاں سپاہی! کیا سونگھ رہے ہو —— مجھے بھی دو"

کندھوں سے نیچے اُتر آؤ۔ اور ڈبیا میں بیٹھ کر جتنا عرصہ چاہو
سونگھو"

" اچھا! تو ڈبیا کا ڈھکنا کھول دو"

سپاہی نے ڈبیا کا ڈھکنا کھول دیا۔ اور جونہی موت ڈبیا میں آئی
جھٹ سے ڈبیا بند کر لی۔ اور ڈبیا کو اپنے بوٹ میں رکھ لیا۔ اتنا کر وہ
پھر خدا کے دربار میں گیا اور اپنی پرانی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

جب خدا نے اُسے دیکھا۔ تو حیران ہو کر پوچھا" ارے! موت
کہاں رکھی ہے۔ تم نے"

" میرے پاس ہے! خداوند!"

" تمہارے پاس ؟"

" جی ہاں! اس وقت میرے بوٹ میں ہے"

"دکھاؤ تو"

"نہیں جی! میں نہیں دکھانے کا ـــــــ اُسے نو سال تک
وہیں قید رہنا چاہیئے ـــــــ نو سال تک موت کو اپنے کندھوں پر
اُٹھائے رکھنا کوئی مذاق نہیں ـــــــ وہیں رہنے دیجیئے اِسے"

"تم اُسے باہر تو نکالو ـــــــ میں نے تمہاری خطا کو معاف
کردیا"

چنانچہ سپاہی نے اپنے بوٹ کے تسمے کھولے اور نسوار کی ڈبیا
نکال کر اُس کا ڈھکنا کھول دیا ـــــــ ڈھکنے کا کھلنا تھا۔ کہ موت
لپک کر اُس کے کندھوں پر سوار ہوگئی۔

خدا نے موت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تم میں اتنی عقل
ہی نہ تھی کہ اپنا حکم بجا لاسکو۔ اِس لئے کندھوں سے اُتر آؤ۔

موت کندھوں سے اُتر آئی

"لو اب تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ کہ اِس سپاہی کی روح قبض کرلو"

"میاں سپاہی! اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ" موت نے سپاہی
کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا"

"جلدی کا ہے کی ہے۔ مرنا تو آخر ہے ہی لیکن پہلے مجھے اِس وقت
کے لئے تیار تو ہو لینے دو"

"بہت بہتر"

چنانچہ سپاہی ایک سفید کفن اوڑھ کر تابوت میں لیٹ گیا"

"کیا اب تیار ہو ؟" موت نے سپاہی سے دریافت کیا"

"بالکل"

"اب اچھی طرح تابوت میں لیٹ جاؤ"

"سپاہی پیٹ کے بل تابوت میں لیٹ گیا"

"یہ کس طرح لیٹ رہے ہو تم ؟"

"تو پھر کس طرح لیٹوں ؟"

"یہ بھی بھلا کوئی لیٹنے کا طریقہ ہے۔ تمہارے لئے اُس حالت میں
مرنا درست ہوگا" سپاہی پہلو کے بل لیٹ گیا

"آہ میرے خدا! کیسے بے وقوف انسان سے پالا پڑا ہے۔ کیا تم
نے کبھی مردوں کو تابوت میں لیٹے ہوئے نہیں دیکھا ـــــــ نکلو
باہر میں تمہیں بتاؤں"

سپاہی تابوت سے باہر نکل آیا اور موت اُس کو طریقہ بتانے کے
لئے تابوت میں لیٹ گئی۔ اُس کا لیٹنا تھا۔ کہ سپاہی نے تابوت
کا ڈھکنا بند کر دیا۔ اور اُس پر مضبوطی سے کیل جڑ دئے۔ اِس طرح
موت کو تابوت میں قید کر کے اُس نے تابوت کو اُٹھایا اور دریا برد کر
دیا۔ موت کو دریا کے سپرد کرنے کے بعد اُس نے پھر خدا کے دربار پر
پہرہ دینا شروع کر دیا۔ جب خدا نے اُسے دیکھا۔ تو حیران ہو کر پوچھا"
ارے! موت کہاں ہے؟"

"میں نے اُسے دریا بُرد کر دیا ہے ——— میرے مالک!"

خدا نے نظر دوڑائی تو موت کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا۔ اُسے دریا
سے نکال کر غضب ناک لہجہ میں پوچھا" میں نے جو تمہیں حکم دیا تھا کہ
اِس سپاہی کو ہلاک کر دو"

میرے مالک! یہ سپاہی بہت مکّار ہے۔ میری اِس کے
سامنے ایک پیش نہیں چلتی

"دیکھو اب اِس کے جھانسے میں نہ آنا۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے
کہ اِس کو فوراً ہلاک کر دو"

بعض کہتے ہیں کہ موت نے سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ لیکن بعض
خیال کرتے ہیں۔ کہ سپاہی نے موت کو پھر دھوکہ دے دیا۔ اور اس
طرح بہت عرصہ تک زندہ رہا اور ابھی اُسے مرے تھوڑا عرصہ
گذرا ہے۔

۱۔ شراب اور شیطان
۲۔ تین سوال

"طالسطائی"
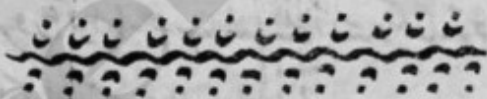
تین سوال

ایک دفعہ کسی بادشاہ کے دل میں خیال آیا۔ کہ اگر اُسے تین چیزیں معلوم ہو جائیں۔ تو اُسے کبھی بھی شکست کا منہ دیکھنا نہ پڑے۔ اور جس کام میں ایک دفعہ ہاتھ ڈال دے۔ حسب خواہش انجام پذیر ہو جائے۔ جن تین چیزوں نے اِس پر رات کی نیند حرام کر دی وہ یہ تھیں۔

(۱) کسی کام شروع کرنے کا کونسا موزوں وقت ہے

(۲) کن اشخاص سے صحبت رکھنی چاہیئے اور کن اشخاص سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

(۳) دنیا میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری چیز کیا ہے

رفتہ رفتہ اِس خیال نے بادشاہ کے دل میں جگہ کر لی۔ اور وہ ہر وقت اِسی جستجو میں رہنے لگا۔ کہ کسی نہ کسی طرح اُسے اُن تین سوالوں کا تسلی بخش جواب حاصل ہو جائے۔

اِسی غرض کے لئے اِس نے ملک بھر میں منادی کرا دی۔ کہ جو

کوئی اُس کے سوالوں کا صحیح جواب دے گا ——— اُس کا منہ موتیوں
سے بھر دیا جائے گا ——— اور منہ مانگا انعام پائے گا۔

ملک کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے عالم و فاضل بادشاہ کے حضور
میں آئے۔ مگر اُن تینوں سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔

پہلے سوال کے جواب میں بعض مفکروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ
کسی کام کے شروع کرنے کا صحیح وقت صرف اُسی صورت میں معلوم
ہو سکتا ہے۔ جب تک انسان اپنے روزمرّہ معمول کے اوقات کو
تقسیم کر کے اُس کا ایک نقشہ مرتب نہ کرے۔ اور اُس پر ہمیشہ کے
لئے کاربند نہ رہے۔ بعض عالموں نے اِسی سوال کے جواب میں یہ
رائے ظاہر کی کہ کسی کام کے لئے موزوں وقت معلوم کرنا اکیلے انسان
کے لئے اگر مشکل نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔ اِس لئے بادشاہ سلامت
کو چاہیئے۔ کہ وہ اِس غرض کے لئے عالموں کی ایک مجلس مقرر کرے
اور اُن کی متفقہ رائے پر عمل کرے۔

لیکن بعض فاضلوں نے اِس رائے پر اعتراض کرتے ہوئے
کہا کہ بعض وقت کئی ایسے کام در پیش ہوتے ہیں۔ جن کے لئے اتنا

وقت نہیں ہوتا۔ کہ عالموں کی مجلس سے رائے طلب کی جا سکے اِس
لئے کسی کام کے لئے موزوں وقت معلوم کرنے کے لیئے بادشاہ سلامت
کو نجومیوں اور جادوگروں سے مشورہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی غیب کے
علم کو جانتے ہیں۔ اِسی طرح دوسرے سوال کے بھی مختلف جواب ملے۔
بعض نے کہا کہ بادشاہ کو صرف وزراء سے صحبت رکھنی چاہیئے۔ تو بعض
نے کہا نہیں ولیوں اور خدا رسیدہ لوگوں کی صحبت ہی ایک بادشاہ کے
لئے ضروری ہے

تیسرے سوال کے جواب میں کہ دنیا میں سب سے اہم اور
ضروری چیز کیا ہے۔ بعض عالموں نے یہ جواب دیا۔ کہ ستائش ہی
دنیا میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔

بعض نے یہ کہا۔ کہ آلاتِ جنگ تو بعض نے کہا۔ کہ نہیں خدا
کی عبادت ہی سب چیزوں پر مقدم ہے۔ اِس لئے بادشاہ کو خدا
کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

ان تینوں سوالوں کے جواب بالکل مختلف تھے۔ اِس لئے
بادشاہ نے اعلان کردہ انعام اُن میں سے کسی کو بھی نہ دیا۔

جب علما فضلا سے خاطر خواہ جوابات نہ مل سکے۔ تو ایک دِن بادشاہ نے ایک فقیر کے پاس جو اپنی ریاضت اور بزرگی کے سبب ملک بھر میں مشہور تھا۔ جانے کی ٹھان لی۔ وہ خدا رسیدہ بزرگ آبادی سے دور ایک جنگل میں فروکش تھا۔ جہاں وہ دن رات خدا کی عبادت میں گزارتا۔

چنانچہ ایک دِن بادشاہ معمولی دہقان کا بھیس بدل کر اُس فقیر کی جھونپڑی کی طرف روانہ ہوگیا۔

جھونپڑی کے قریب پہنچ کر بادشاہ نے دیکھا۔ کہ فقیر زمین کھودنے میں مصروف ہے۔ بادشاہ کو دیکھ کر فقیر نے اسلام کیا۔ لیکن کچھ کہے سنے بغیر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

فقیر اِس قدر لاغر اور کمزور تھا۔ کہ کدال کی ایک ضرب کے بعد ہی سانس درست کرنے کے لئے تھوڑی دیر ٹھہر جاتا۔

بادشاہ اُس مردِ لاغر کے قریب گیا اور کہا "اے عقلمند درویش —— میں تیری خدمت میں تین سوال لے کر حاضر ہوا ہوں۔ کیا تو اُن تینوں سوالوں کا جواب دے سکتا ہے"

(۱) کسی کام کے شروع کرنے کا موزوں وقت کیا ہے؟

(۲) مجھے کن اشخاص سے صحبت رکھنی چاہیئے۔ اور کن سے پرہیز کرنا چاہیئے؟

(۳) دنیا میں سب سے زیادہ اہم ضروری کام کیا ہیں۔

فقیر بادشاہ کی گفتگو کو خاموشی سے سنتا رہا۔ مگر کوئی جواب نہ دیا۔ اور کدال پکڑ پھر زمین کو کھودنا شروع کر دیا۔

"تم کدال چلاتے چلاتے تھک گئے ہو —— کدال مجھے پکڑا دو اور تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لو" بادشاہ نے فقیر سے کہا

"شکریہ" یہ کہ کر فقیر نے کدال بادشاہ کو پکڑا دی۔ اور آپ زمین پر ہانپتا ہوا بیٹھ گیا۔ دو کیاریاں کھودنے کے بعد بادشاہ نے اپنے سوالات پھر دہرائے لیکن فقیر خاموش رہا۔ اور بادشاہ کے سوالات کا جواب نہ دیا۔ زمین سے اٹھا اور کہنے لگا "اب آپ آرام فرمائیں۔ میں اِس کام کو ختم کر لیتا ہوں"

مگر بادشاہ نے فقیر کو کدال نہ دی اور زمین کھودنی شروع کر دی —— بادشاہ اِسی طرح زمین کھودتا رہا۔ حتےٰ کہ سورج غروب ہوگیا

آخر کار تنگ آکر کدال کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہنے لگا" عقلمند درویش
میں تیری خدمت میں اس لئے حاضر ہوا تھا۔ کہ تو میرے سوالات کا جواب
دے گا ـــــ اگر تو اُن سوالات کا جواب نہیں دے سکتا۔ تو صاف
کہ دے تاکہ میں واپس چلا جاؤں"

"وہ دیکھو کون بھاگا چلا آرہا ہے ـــــ آؤ دیکھیں تو یہ کون
ہے؟" درویش نے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

بادشاہ نے مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی جنگل کے گھنے درختوں کے باہر
اُن کی طرف بھاگا چلا آرہا ہے۔ وہ آدمی اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں
سے تھامے ہوئے تھا۔ جس سے خون فوارے کی مانند بہ رہا تھا۔

بادشاہ کے قریب پہنچ کر وہ شخص بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑا۔

درویش اور بادشاہ دونوں نے مل کر اُس کے کپڑے اُتار دیئے تو
معلوم ہوا کہ اُس کے پیٹ میں ایک بڑا سا زخم ہے۔ جس سے خون
کافی تعداد میں بہ چکا ہے۔ بادشاہ نے بڑی احتیاط سے اس
زخم کو دھوکر اپنے رومال کی پٹی بنا کر اُس پر باندھ دی۔ لیکن پھر بھی زخم
سے خون نکلنا بند نہ ہوا۔

بادشاہ خون سے تر پٹی اُتارتا اور اُسے اچھی طرح دھوکر پھر اُس
کے زخم پر باندھ دیتا۔ اس عمل کو بار بار دہرانے سے خون نکلنا بند ہوگیا
خون کے بند ہوجانے پر اُس شخص کو ہوش آئی اور اس نے اشارے
سے کچھ پینے کے لئے مانگا۔

اس پر بادشاہ دوڑا ہوا گیا۔ اور کنوئیں سے تازہ پانی لاکر اُسے دے
دیا۔

اب سورج غروب ہوچکا تھا۔ چنانچہ بادشاہ اور درویش
دونوں اس شخص کو اُٹھا کر جھونپڑی میں لے آئے۔ اور اُسے بستر پر
لٹا دیا۔ بستر پر لیٹتے ہی وہ شخص سوگیا۔ بادشاہ دن بھر کی تھکاوٹ سے
چور ہوکر دہلیز پر سستانے کے لئے بیٹھا کہ وہیں سوگیا۔

جب صبح خواب سے بیدار ہوا تو زخمی کو اپنی طرف غور سے گھورتے
ہوئے دیکھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے" زخمی نے بادشاہ سے کہا۔ جو اب پوری
طرح بیدار ہوکر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "میں تمہیں نہیں جانتا"
ـــــ پھر یہ معافی کی درخواست کیسی؟" بادشاہ نے زخمی سے

دریافت کیا "آپ مجھے نہیں پہچانتے مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتا
ہوں ــــــ میں آپ کا دشمن ہوں ــــــ وہ دشمن جس کے
بھائی کو قتل کروا کر آپ نے اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا ــــــ وہ دشمن
جس نے اپنے بھائی کے خون کا انتقام لینے کی قسم لے رکھی تھی۔ مجھے معلوم
تھا۔ کہ آپ درویش کو ملنے کے لئے باہر آئینگے۔ اس لئے میں نے ارادہ
کر لیا تھا کہ آپ کو واپسی پر قتل کر دوں۔ چنانچہ آپ کی تلاش میں اپنی
جائے پناہ سے نکلا۔ مگر آپ کے محافظوں کے ساتھ دوچار ہونا پڑا
اُنہوں نے مجھے پہچان لیا۔ اور مجروح کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح میں اُن
کی گرفت سے بچ نکلا۔ اُن کے ہاتھوں سے تو بچ گیا۔ مگر میری حالت
بہت نازک تھی۔ زخم سے فواروں خون نکل رہا تھا۔ اگر آپ میرے
حال پر رحم کر کے مرہم پٹی نہ کرتے۔ تو موت یقینی تھی۔ میں آپ کی موت
کا خواہاں تھا۔ مگر آپ نے میری جان بچائی۔ اب اگر میں زندہ رہا تو
تمام عمر ایک وفادار غلام کی طرح آپ کی خدمت بجالاؤنگا۔ اور اپنے
بیٹوں کو تلقین کر دونگا ــــــ کیا آپ مجھے معاف نہ فرمائینگے"
اس آسانی سے ایک جانی دشمن کو دوستی کا ہاتھ بڑھاتے دیکھ

کر بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس لئے اُس نے نہ صرف اُسے معاف کر
دیا۔ بلکہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے علاج کے لئے شاہی حکیم اور شاہی نوکر
مقرر کر دے گا۔ اور اُس کی کھوئی ہوئی جائیداد بھی واپس کر دے گا۔

زخمی سے رخصت لے کر بادشاہ جھونپڑی سے باہر آیا اور
درویش کی تلاش شروع کی۔ جھونپڑی کو خیرباد کہنے سے پیشتر وہ آخری بار
درویش کی خدمت میں اِن سوالوں کے جواب کے لئے درخواست کرنا
چاہتا تھا۔

درویش کیاریوں کے پاس ہی گھٹنوں کے بل بیج بو رہا تھا۔ بادشاہ
اس کے پاس گیا اور کہنے لگا "عقلمند درویش! میں تیری خدمت میں پھر
حاضر ہوا ہوں۔ کہ تو میرے سوالوں کا جواب دے!"

"تمہارے سوالوں کا جواب تو مل گیا ــــــ اب کیا چاہتے ہو؟"
درویش نے بادشاہ کی طرف نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا

"وہ کس طرح؟ ــــــ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟"

"سنو! ــــــ اگر کل تم میری کمزوری کا خیال کرتے ہوئے کیاریاں
کھودنے کے لئے نہ ٹھہرتے اور اس کی بجائے واپس چلے جاتے تو تمہارا

دشمن تم پر ضرور حملہ آور ہوتا۔ چنانچہ وہ وقت ہی تمہارے لئے موزوں تھا۔ جب تم زمین کھودنے میں مصروف تھے، میری ذات ہی اِس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی اور تمہاری ہمدردی کیا اطب ہی سب سے زیادہ ضروری اور اہم کام تھا

اِس کے بعد جب زخمی شخص ہماری طرف آرہا تھا۔ تو تمہارے لئے کسی اچھے کام کرنے کے لئے وہی وقت موزوں تھا۔ جب تم اُس کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ کیونکہ اگر تم اُس کی اچھی طرح نگہداشت نہ کرتے تو تمہارا ایک جانی دشمن تمہارے ساتھ صلح کئے بغیر اِس جہان سے رخصت ہو جاتا۔ پس وہ شخص ہی اِس وقت سب سے زیادہ ضروری اور اہم کام تھا ——— اِس لئے یاد رکھو۔ کہ کسی خاص کام کے لئے صرف ایک ہی وقت موزوں ہوا کرتا ہے۔ جبکہ ہم میں اتنی قوت ہے۔ کہ ہم اُسے سرانجام دے سکیں۔ سب سے زیادہ ضروری شخص وہی ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ تم اِس وقت موجود ہو۔ کیونکہ اِس بات کا معلوم کرنا کہ اُس شخص کے سوا تمہیں کسی اور شخص سے بھی واسطہ پڑے گا۔ انسان کے فہم و قیاس سے بالا ہے۔ اور سب سے ضروری اور اہم

کام اِس شخص کے ساتھ نیکی کرنا ہے ——— کیونکہ خدا نے انسان کو صرف اِسی غرض کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔

۱- خادمہ
۲- ایثار

} "چیخوف"

"خادمہ"

رات ______

سیزدہ سالہ آیا وارکا جھولے کو آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے۔ جس میں ننھا سا بچہ لیٹا ہوا ہے۔ اور دبی زبان میں لوری گنگنا رہی ہے۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ ——— میں تمہیں لوری دے رہی ہوں"

جھولے کے سامنے ایک سبز رنگ کا لیمپ جل رہا ہے۔ کمرے میں ایک رسی پر سیاہ پتلون اور ننھے کے کپڑے لٹک رہے ہیں۔ جن کے لمبے لمبے سائے وارکا اور بچے کے جھولے پر پڑ رہے ہیں ......

لیمپ کی بتی کے شعلے کے ساتھ سائے بھی رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے تیز ہوا میں پتیاں کانپ رہی ہوں

کمرے میں سخت حبس ہو رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے گوبھی کا بد بودار شوربہ پاس ہی رکھا ہو۔ یا یہ جگہ کسی بوٹ بنانے والے کی دکان ہو۔

بچہ چلا رہا ہے۔ گو اُسے چلاتے چلاتے یہ دقت آ گیا ہے۔ اور وہ اِس چیخ پکار سے تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی روئے جا رہا ہے۔ اور یہ معلوم نہیں کہ کب چپ ہو۔

بیچاری وارکا کو نیند آ رہی ہے۔ نیند کے غلبہ سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ سر آگے کو جھکا جا رہا ہے۔ گردن میں شدت کا درد ہو رہا ہے اِس میں اتنی طاقت نہیں، کہ اپنے لبوں یا آنکھوں کو ہلا سکے۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اِس کا کاسۂ سر خشک چوب سے تراشا ہوا ہے۔ اور سکڑ کر سوئی کے سرے برابر رہ گیا ہے۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ. . . . . ." وہ برابر گنگنا رہی ہے۔

جھینگر دردناک راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔ ملحقہ کمرے سے آقا اور اُس کے شاگرد افانسی کے خراٹوں کی آواز آ رہی ہے ——— بچے کا جھولا غمناک آواز پیدا کر رہا ہے۔ یہ تمام آوازیں مل کر ایک تسکین بخش راگ پیدا کر رہی ہیں ——— اُن اشخاص کے لئے جو بستر میں آرام سے لیٹے ہوں۔ مگر اس وقت یہ راگ تکلیف دہ اور گراں بار معلوم ہو رہا ہے۔ اِس لئے کہ اِس کی موجودگی میں وارکا کا سو جانا یقینی ہے۔

اور اگر وارکا خدا نہ کرے ——— خدا نہ کرے سو جائے تو اُس کا آقا اور مالکہ اُسے خوب مار پیٹ کرے

لیمپ کی بتی کانپنے لگتی ہے۔ سبز روشنی کے دھبے اور لانبے لانبے سائے حرکت کرنے لگ جاتے ہیں۔ جو وارکا کی نیم وا خواب آلود آنکھوں اور تھکے ہوئے دماغ کے سامنے دھند میں لپٹی ہوئی تصویریں معلوم ہوتی ہیں

اب اِس کی نظروں میں یہ دھندلی تصویریں سیاہ بادلوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جو آسمان میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوں ——— یکایک ہوا چلتی ہے۔ جو بادلوں کو منتشر کر دیتی ہے۔ اب وارکا پتلے کیچڑ سے بھری ہوئی ایک وسیع سڑک کو دیکھتی ہے۔ جس کے دائیں بائیں چھکڑے قطار در قطار کھڑے ہیں۔ اور درمیان میں لوگ کندھوں پر تھیلے اُٹھائے کام سے چور چل رہے ہیں ——— دفعتاً یہ لوگ معہ اپنے تھیلوں کے کیچڑ میں گر پڑتے ہیں۔

"تم کیوں گرے ہو؟" وارکا اُن سے سوال کرتی ہے۔

وہ جواب دیتے ہیں "سونے کے لئے"

یہ کہ کر وہ گہری اور میٹھی نیند سو جاتے ہیں۔ جبکہ کوے اور نیل کنٹھ بجلی کی
تاروں پر بیٹھے اُن کو جگانے کیلئے بچوں کی طرح چیخ رہے ہوتے ہیں۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ ......" وار گا گنگناتی اور اپنے
آپ کو ایک تنگ و تار جھونپڑی میں پاتی ہے۔ جہاں اُس کا مرحوم
باپ درد کی وجہ سے زمین پر لیٹ رہا ہے۔ درد کی شدت کا یہ عالم
ہے۔ کہ وہ منہ سے سوائے اُف ــــ اُف ــــ اُف اور کچھ نہیں
بول سکتا۔

اِس کی ماں پلیوگیویا گھر میں موجود نہیں۔ کیونکہ وہ آقا کو خبر دینے
گئی ہوئی ہے۔ کہ یافین مر رہا ہے۔ اُس کو گئے ہوئے ایک عرصہ گذر
چکا ہے۔ حالانکہ اِس وقت تک اُسے واپس آجانا چاہئے تھا۔ وار گا
انگیٹھی کے قریب خاموش بیٹھی ہوئی اپنے والدہ کو کراہتا سن رہی ہے
دفعتاً وہ جھونپڑی کے باہر کسی گاڑی کی آواز سنتی ہے ــــ اتنے
میں ایک جوان ڈاکٹر اندر داخل ہوتا ہے جسکا چہرہ تاریکی کی وجہ سے
بخوبی نظر نہیں آتا ــــ وار گا اُسے اتنا کہتا ہوا سنتی ہے۔

"روشنی کر دو!"

جواب میں یافین اُف اُف کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتا
پلیوگیویا دیا سلائی ڈھونڈنے کی خاطر انگیٹھی کی طرف دوڑتی ہے
ــــ ایک منٹ مکمل خاموشی میں گذر جاتا ہے۔ اِس کے بعد
ڈاکٹر اپنی جیب سے دیا سلائی نکال کر روشن کرتا ہے۔

"جناب! ذرا اِسے روشن ہی رکھئے ــــ میں ابھی آئی یہ
کہتی ہوئی پلیوگیویا جھونپڑی کے باہر دوڑ کر موم بتی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑہ
لاتی ہے۔

یافین کے رخسار سُرخ ہو رہے ہیں۔ اور اس کی آنکھیں غیر معمولی
طور پر چمک رہی ہیں۔ جیسے وہ جھونپڑی اور ڈاکٹر کو چیرتی ہوئی کسی موہوم
چیز کا مطالعہ کر رہی ہو

"میاں کیا سوچ رہے ہو؟ ــــ کب سے یہ تکلیف ہے
تمہیں؟" ڈاکٹر اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہتا ہے۔

"جناب! مر رہا ہوں ــــ میرا وقت قریب آگیا ہے حضور!
ــــ تھوڑے عرصے کے بعد میں اِس دنیا سے رخصت ہونے والا
ہوں"

"بیہودہ باتیں مت کرو! ہم تمہیں صحتیاب کر دیں گے"

"اِس عنایت کے لئے ہم غریب شکر گذار رہیں جناب! ——— معلوم ہوتا ہے ——— جب موت آتی ہے۔ تو پھر اُس سے بچنا ؟ ؟"

ڈاکٹر یافین نصف گھنٹہ معائنہ کرنے کے بعد کہتا ہے "معاملہ میری مدد سے باہر ہے۔ تمہارے لئے ضروری ہے۔ کہ تم کسی ہسپتال چلے جاؤ۔ وہیں پر تمہارا علاج ہو سکتا ہے ——— بس جلدی جاؤ ——— بہت دیر ہو چکی ہے اور ہسپتال والے سو رہے ہونگے ——— مگر اس کی کوئی پرواہ نہیں میں تمہیں ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں ——— سنتے ہو یا نہیں ؟"

"مہربان جناب! وہ اتنی دور پیدل کسطرح جائے ——— ہمارے پاس کوئی گھوڑا نہیں" پلیوگیویا نوجوان ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے

"فکر مت کرو۔ میں تمہارے آقا سے کہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں گھوڑا مہیا کر دے گا"

ڈاکٹر رخصت ہو جاتا ہے ——— موم بتی بھی رخصت ہو

جاتی ہے۔

اب پھر وہی "اُف۔ اُف" کی آواز شروع ہو جاتی ہے۔

کوئی نصف گھنٹہ کے قریب جھونپڑی کے باہر کوئی گاڑی ٹھہرتی ہے ——— یہ گاڑی چھکڑا تھا۔ جو یافتن کو ہسپتال لے جانے کے لئے اس کے آقا نے بھیجا تھا ——— یافتن تیار ہو کر چلا جاتا ہے۔ اب دن چڑھ آیا ہے۔ پلیوگیویا گھر پر نہیں۔ کیونکہ وہ یافتن کی خبر لینے کے لئے ہسپتال گئی ہوئی ہے ——— کسی جگہ بچے کے چلّانے کی آواز آ رہی ہے۔ اور دار کا کسی کو اپنی آواز میں ہی گنگناتا ہوا سنتی ہے۔

"سو جاؤ میرے ننھے چاند سو جاؤ ———"

اتنے میں پلیوگیویا واپس آتی ہے۔ اور اپنی چھاتی پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے دبی زبان میں کہتی ہے "ڈاکٹروں نے اُسے رات تک کے لئے تو اچھا کر دیا۔ مگر صبح کے وقت اُس نے اپنی روح خدا کے حوالہ کر دی ——— خدا اُس کی روح کو چین بخشے ——— وہ کہتے ہیں۔ کہ اُسے بہت دیر بعد ہسپتال لایا گیا۔ اِس لئے چاہیے تھا کہ وہ پہلے ہی وہاں چلا جاتا"

وارکا یہ سنتے ہی دیوانہ وار سڑک پر چلّانا شروع کر دیتی ہے۔ مگر دفعتاً کوئی شخص اُس کے سر پر ایسی ضرب لگاتا ہے۔ کہ اُس کی پیشانی ایک درخت کے تنے سے ٹکراتی ہے ——— آنکھ اُٹھا کر دیکھتی ہے تو سامنے اُسے اپنا آقا ——— یعنی پاپوش ساز نظر آتا ہے

"نابکار! ——— بچّہ چلّا رہا ہے۔ اور تم گہری نیند سو رہی ہو"، پاپوش ساز وارکا کو سر پر تھپڑ مارتا ہوا کہتا ہے۔

وارکا سر کو جنبش دے کر جھولا ہلانا اور لوری دینا شروع کر دیتی ہے کمرے میں روشنی کے دھبے اور کپڑوں کے سائے کانپتے ہیں اور وارکا کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلاتے معلوم ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سب چیزیں پھر وارکا کے دماغ پر قابو پا لیتی ہیں۔ اب پھر وہ کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک دیکھتی ہے۔ جس میں تھیلوں والے شخص گہری نیند سو رہے ہیں انہیں سوتے دیکھ کر وارکا کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سو جائے۔ مگر اُس کی ماں پلیگیویا اُس کے ساتھ ہے جو اُسے آگے دھکیل رہی ہے ——— وہ دونوں نوکری ڈھونڈنے کی خاطر شہر کی جانب بڑھ رہی ہیں۔

"خدارا ہمیں کچھ بھیک دیجئے ——— خدارا ہم پر رحم فرمایئے" اُسکی ماں راہ گذروں سے مانگتی ہے۔

"بچے کو یہاں بھیجدو" ایک مانوس آواز جواب دیتی ہے

وہی آواز دوبارہ پکارتی ہے "بچے کو یہاں بھیجدو ——— کیا سن رہی ہو بدقسمت لڑکی؟" یہ سنتے ہی وارکا اُچھل پڑتی ہے۔ اور اپنے اردگرد دیکھتی ہے۔ کہ معلوم کرے معاملہ کیا ہے ——— اب نہ وہ بڑی سڑک ہے۔ اور نہ اُس کی ماں پلیگیویا اور نہ ہی وہ شخص جن سے وہ بھیک مانگ رہی تھی۔ اگر کوئی اِس وقت کمرہ میں موجود ہے تو اُس کی مالکہ جو بچے کو دودھ پلانے کے لئے آئی ہوئی ہے۔

وارکا کھڑی انتظار کر رہی ہے۔ کہ وہ مالکہ کے دودھ پلانے کے بعد بچّہ کو پھر لے لے۔ کھڑکیوں سے باہر دھندلی سی روشنی نظر آ رہی ہے۔ کمرے میں کپڑوں کے سائے اور روشنی کے دھبے آہستہ آہستہ زرد ہو رہے ہیں ——— تھوڑی دیر بعد سورج طلوع ہو گا۔

"اِسے لے جاؤ ——— عرصہ سے چلّا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ اِس پر جادو کیا گیا ہے"، مالکہ اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہتی ہے

وارکا بچہ کو لے کر جھولے میں لٹا دیتی ہے۔ اور اُسے ہلانا شروع کر
دیتی ہے۔ روشنی کے دھبے اور سائے قریباً قریباً غائب ہو چکے ہیں۔ اب
کمرہ میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو اُس کے دماغ اور آنکھوں پر اثر پذیر
ہو سکے۔ مگر وہ پھر بھی پہلے کی طرح سونا چاہتی ہے۔

وارکا اپنا سر جھولے کے کنارے رکھ کر کوشش کرتی ہے۔ کہ کسی
نہ کسی طرح نیند پر غلبہ پالے مگر بے سود۔ اُس کی آنکھیں ملی جا رہی ہیں اور
سر بدستور بھاری ہو رہا ہے۔

"وارکا انگیٹھی میں کوئلے ڈالو" وہ دروازہ سے اپنے آقا کی آواز سنتی
ہے۔

چنانچہ اب وقت آگیا ہے۔ کہ وارکا اُٹھ کر گھر کا کام کاج شروع
کر دے ——— جھولے کو چھوڑ کر کوئلہ لانے کے لئے بھاگی ہوئی
گودام میں جاتی ہے ——— وہ اب خوش ہے ——— اس لئے
کہ جب بدن حرکت میں ہو تو نیند بہت کم ستاتی ہے۔

کوئلہ لا کر وہ انگیٹھی گرم کرتی ہے۔ اب اُسے محسوس ہوتا ہے۔ کہ اُس
کا چوبی چہرہ پھر زندگی اختیار کر رہا ہے۔ اور خیالات آہستہ آہستہ صاف

ہو رہے ہیں

"وارکا سماوار گرم کرو" اُس کی مالکہ چلاتی ہے۔

اس پر وارکا لکڑی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹتی ہے۔ اور ابھی
انہیں جلانے نہیں پائی ہوتی کہ ایک تازہ حکم سنتی ہے۔

"وارکا اپنے آقا کے بڑے بوٹ صاف کرو"

وہ بڑے بوٹوں کو لے کر فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سوچتی ہے کہ کیا
ہی اچھا ہو اگر وہ اس بڑے بوٹ میں سر ڈال کر تھوڑا سا آرام کرے ———
یک لخت وہ بوٹ بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ اور سارے کمرے میں پھیل
جاتا ہے۔ وارکا کے ہاتھ سے برش گر پڑتا ہے۔ مگر وہ اُسی وقت سر کو
جنبش دے کر آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اور اپنے گرد و نواح کی چیزوں کو اس
انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ بڑی ہو کر آنکھوں کے سامنے
حرکت نہ کریں۔

"وارکا! سیڑھیوں کو دھو ڈالو ——— اتنی میلی سیڑھیاں دیکھ کر
گاہک کیا خیال کریں گے۔ مجھے تو شرم محسوس ہوتی ہے۔
وارکا سیڑھیوں کے دھونے کے علاوہ کمروں کو بھی صاف کرتی ہے

اور پھر دوسرے سماوار کو گرم کرنے کے بعد دکان کی طرف بھاگی جاتی ہے —— اُسے وہاں بہت کام کرنے ہیں اس لئے وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتی۔

اِس سے بڑھ کر کوئی اور تکلیف دہ کام نہیں ہو سکتا۔ کہ باورچی خانہ میں منیر کے قریب بیٹھ کر آلو تراشے جائیں۔ وارکا کا سر منیر پر جھکا جا رہا ہے، آلو اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتے نظر آتے ہیں، چاقو اس کے ہاتھ سے پھسل جاتا ہے۔ اور اُس کے کانوں میں مالکہ کی آواز گونج رہی ہوتی ہے۔ جو اُس کے قریب قمیض کو کہنیوں تک چڑھائے بلند آواز میں باتیں کر رہی ہوتی ہے۔

سارا دن کپڑے دھونے، برتن صاف کرنے، کھانا چننے اور سینے پرونے میں بسر کرنا بھی آلو تراشنے کی طرح تکلیف دہ ہے —— کبھی کبھی اِن کاموں سے تنگ آ کر وارکا اتنی بیتاب ہو جاتی ہے۔ کہ ننگے فرش پر سو جائے۔

دن گذر جاتا ہے —— کھڑکیوں کو تاریک ہوتے۔ دیکھ کر وارکا کنپٹیوں کو زور سے دباتی ہے۔ جو چوبِ خشک سے تراشی ہوئی

محسوس ہوتی ہیں —— سنتی ہے —— گو اُسے خود معلوم نہیں کیوں؟

شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی اس کی نیم وا آنکھوں کے لئے وعدۂ خواب لے کر آتی ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد مہمان آ جاتے ہیں۔

"وارکا سماوار گرم کرو" اُس کی مالکہ بلند آواز میں حکم دیتی ہے۔

چونکہ سماوار چھوٹا ہے۔ اِس لئے اُسے تمام مہمانوں کو چائے پلانے کے لئے اُسے پانچ چھ مرتبہ گرم کرنا پڑتا ہے۔ چائے تقسیم کرنے کے بعد وارکا دوسرے احکام کی منتظر ایک گھنٹہ تک وہاں کھڑی رہتی ہے۔

"وارکا بھاگ کر تین بوتلیں بیر کی خرید لاؤ"

وارکا اِس خیال سے کہ تیز دوڑنے سے نیند کا غلبہ دور ہو جائے گا۔ بیر خریدنے کے لئے بھاگی ہوئی جاتی ہے۔

"وارکا تھوڑی سی ووڈکا لاؤ[1] —— وارکا بوتل کھولنے کا اوزار لاؤ —— وارکا اِس گلاس کو صاف کرو!"

آخرش مہمان رخصت ہو جاتے ہیں، کمرے کی روشنی گل کر دی

[1] روسی قسم کی شراب

جاتی ہے۔ اور آقا و مالکہ دونوں سونے کے لئے چلے جاتے ہیں

"بچے کا جھولا ہلاتی رہو" وارکا آخری حکم سنتی ہے۔

انگیٹھی میں جھینگر دردناک راگ الاپتے ہیں، روشنی کے دھبے اور کپڑوں کے سائے کا رقص وارکا کی آنکھوں پر پھر قابض ہو کر اس کے دماغ کو دھندلا بنا دیتا ہے

"سو جاؤ میرے ننھے سو جاؤ......" وہ گنگنانا شروع کر دیتی ہے

بچہ چلاتا ہے اور چلاتے چلاتے تھک جاتا ہے —— اب وارکا وہی کیچڑ سے لت پت سڑک، تھیلوں والے مزدور، اپنی ماں پیلاگیویا اور باپ کو دیکھتی ہے —— وہ اِن دھندلی تصویروں کو اچھی طرح سمجھتی ہے، سب کو پہچانتی ہے۔ مگر نیم خوابی کی حالت میں وہ اُس طاقت کو جس نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ جو اس کی چھاتی پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ اور اُسے زندہ رہنے دیتا، نہیں سمجھ سکتی۔ اِس طاقت کی جستجو کے لئے وہ اپنے ارد گرد نظر دوڑاتی ہے۔ تاکہ اُس کے پنجوں سے بھاگ نکلے۔ مگر بے سود۔ آخر کار اس تلاش سے تنگ آکر وہ اُس قوت کو ڈھونڈنے کے لئے آخری کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنی تمام قوتیں صرف

دیتی ہے۔

روشنی کے رقصاں دھبوں اور کپڑوں کے متحرک سائے پر نظر دوڑانے کے بعد وہ اُس دشمن کو پا لیتی ہے۔ جو اُس کی زندگی میں سد راہ ہو رہا ہے وہ دشمن بچہ تھا۔

وہ ہنستی ہے۔ اِس خیال سے کہ ایسے آسان معمّہ کا حل وہ اِس سے پہلے نہ کر سکی۔ روشنی کے دھبے، کپڑوں کے سائے اور جھینگر بھی مسکراتے اور متحیر معلوم ہوتے ہیں۔

یہ خیال وارکا کے دماغ پر پوری طرح مسلط ہو جاتا ہے۔ چوکی سے اُٹھ کر مسکراتی ہوئی، بغیر جھپکنے والی آنکھوں سے کسی موہوم چیز کو دیکھتی ہوئی وہ کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتی ہے —— وہ خوش ہے اور یہ خیال اُس کی خوشی کو دوبالا کر رہا ہے۔ کہ تھوڑے عرصے کے بعد وہ جس نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں موجود نہ ہوگا —— بچے کی موت کے بعد نیند —— نیند —— نیند ....

روشنی کے دھبوں کو دیکھ کر ہنستی، آنکھیں جھپکاتی اور انگلیوں کو حرکت دیتی ہوئی، وارکا بچے کے جھولے کی طرف بڑھتی ہے۔

بچے کو ہلاک کر کے وہ فوراً زمین پر لیٹ جاتی ہے ـــــــ خوشی
کی وجہ سے ہنستی ہے۔ کہ وہ اب آرام سے سو سکے گی ـــــــ تھوڑی
دیر کے بعد وہ گہری نیند سو جاتی ہے ـــــــ موت کی گہری
نیند۔
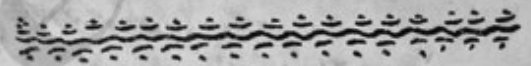
"ایثار"

میں شکار کھیلنے کے بعد گھر کے باغ کی روش پر سے گذر رہا تھا۔
میرا وفادار کتا مجھ سے چند گزوں کے فاصلہ پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔
یک لخت اس کی رفتار مدہم پڑ گئی۔ اگلے پنجوں کو اس طرح اُٹھانے
لگا گویا کسی شکار کو سونگھ رہا ہے۔

جب میں نے روش پر نظر دوڑائی تو مجھے قریب ہی زمین پر چڑیا
کا ایک بچہ دکھائی دیا۔ جس کی چونچ زرد تھی۔ اور بدن پر نرم نرم روئیں
اُگ رہے تھے۔ یہ غالباً اپنے گھونسلے سے گر پڑا تھا۔ کیونکہ آج ہوا
بہت تیز چل رہی تھی۔ اور روش کے آس پاس لگے ہوئے درخت
زور زور سے ہل رہے تھے

معصوم بچہ چپ چاپ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اڑنے کے لئے ننھے
ننھے پر پھیلاتا مگر اتنی طاقت نہ تھی کہ پرواز کر سکے ـــــــ بیچارہ
پھڑپھڑا کر رہ جاتا

میرا کتا اُس کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ کہ دفعتاً قریب

کے درخت سے ایک چڑیا اُتری اور کتے اور بچے کے درمیان زمین
پر اس طرح آ پڑی جیسے پتھر گر پڑا ہو۔

کتے کے کھلے ہوئے جبڑوں کی طرف دیکھ کر ایک دردناک اور رحم
طلب آواز میں چلائی اور اُس کی طرف جھپٹ پڑی —— وہ اپنے
ننھے بچے کو میرے کتے سے بچانا چاہتی تھی۔ اسی غرض کے لئے اِس نے
اُسے اپنے بدن سے ڈھانپ لیا اور چیخ پکار شروع کردی ——
اُس کے چھوٹے گلے میں آواز گھٹنے لگی —— تھوڑی دیر کے بعد بے
جان ہو کر گری اور مر گئی —— اور اس طرح اپنے آپ کو قربان کر
دیا۔

وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچے کو کتے کا لقمہ بنتے نہیں دیکھ
سکتی تھی —— اُس کی نظروں میں میرا کتا غالباً ایک ہیبت ناک
دیو کی مانند تھا۔

وہ کیا شے تھی۔ جو چڑیا کو شاخ صنوبر سے کشاں کشاں زمین پر
لائے؟

میرا کتا حساس تھا۔ چڑیا کو اس طرح قربان ہوتے دیکھ کر

ٹھٹکا اور ایک طرف ہٹ گیا میں نے اُسے اپنی طرف اشارہ سے
بلا لیا اور آگے بڑھ گئے۔

یہ واقع دیکھ کر مجھے تسکین سی معلوم ہوئی —— روح سے
ایک بوجھ ہلکا ہوتا نظر آیا۔ اُس بہادر چڑیا کی غیر معمولی جرأت نے میرے
دل میں احترام اور احساس فرض کے جذبات موجزن کر دئے۔

میں نے خیال کیا کہ محبت، موت اور اُس کی ہیبت سے کہیں
زیادہ ہے۔ اور صرف محبت ہی ایسی چیز ہے۔ جو زندگی کے نظام
کو قائم اور متحرک رکھتی ہے۔

"مزدور کی شکست"

(گورگی)
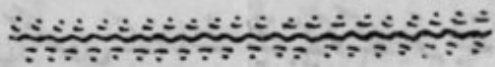
"مزدور کی شکست"

ہم تعداد میں چھبیس تھے ——— چھبیس متحرک مشینیں ایک مکان میں مقید۔ جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک بسکٹوں کیلئے میدہ تیار کرتے۔

ہماری زندان نما کوٹھڑی کی کھڑکیاں اینٹوں اور کوڑا کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کی طرف کھلتیں جن کا نصف حصہ آہنی چادر سے ڈھکا ہوا اور شیشے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس لئے سورج کی شعاعیں ہم تک نہ پہنچ سکتیں۔

ہمارے آقا نے کھڑکی کا نصف حصہ اس لئے بند کروا دیا تھا۔ کہ ہمارے ہاتھ اس کی روٹی میں سے ایک لقمہ بھی غریبوں کو دینے کے لئے باہر نہ نکل سکیں یا ہم اُن بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں۔ جو کام کی قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔

ہمارا مالک "جیل کے غلاموں" کے نام سے پکارتا اور کھانے کے لئے گوشت کی بجائے انتڑیاں دیتا۔

اس سنگین زندان کی چھت تلے جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑیوں
کے جالے سے بھری پڑی تھی۔ ہم نہایت تکلیف میں زندگی بسر کر
رہے تھے۔

اسی چاردیواری میں جو کیچڑ اور میدہ کے خمیر سے اٹی ہوئی تھی
ہماری زندگی ـــــ غم و فکر کی زندگی تھی ...... پوری
نیند اور آرام کئے بغیر ہم ہر روز صبح پانچ بجے بیدار ہو کر نیم خوابی کی
حالت میں ہی اس میدہ سے بسکٹ تیار کرنے لگ جاتے جو
ہمارے سوتے وقت تیار کیا ہوتا

اس طرح صبح سے لے کر رات کے دس بجے تک ہم میں سے
کچھ تو بسکٹوں کے لئے خمیر تیار کرکے اور کچھ میدہ گوندھتے۔ اتنا عرصہ
ہی ابلتے ہوئے پانی کی آواز بھٹی میں نانبائی کی سلاخ ڈالنے کا شور
ہمارے کانوں میں گونجتا رہتا۔

صبح سے لے کر شام تک بھٹی آتشکدہ کی طرح دہکتی
رہتی۔ جس کی سرخ شعاؤں کا عکس دیوار پر اس طرح
رقص کرتا معلوم ہوتا جیسے وہ ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش

ہنسی ہنس رہا ہو۔

وہ بڑی بھٹی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی۔ جو اپنے
بڑے حلق سے آگ اگل رہا ہو۔ ہمارے سامنے جہنم کی
جھلسا دینے والی گرمی ایسے سانس لے رہا ہو۔ اور ہمارے
غیر مختتم کام کو اپنی پیشانی کے سیاہ و تاریک سوراخوں سے
مطالعہ کر رہا ہو۔ یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے
ـــــ آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی
اور رحمدلی کے جذبہ سے عاری ہوں یہ آنکھیں ہمیشہ تاریک
نظر سے دیکھتیں۔ جیسے وہ اپنے غلاموں کو دیکھتے دیکھتے
تنگ آ گئی ہوں۔ اور اس بات کی توقع چھوڑ دی ہو کہ
جنسِ آدم میں سے ہیں۔

ہم ہر روز ناقابل برداشت گرد و غبار اور جھلسا دینے والی بھاپ
کے درمیان اپنی عرق آلود پیشانیوں سے میدہ گوندھتے اور بسکٹ
تیار کرتے۔ ہمیں اس کام سے سخت نفرت تھی۔ اور یہی وجہ تھی
کہ ہم تیار کردہ بسکٹوں پر سیاہ اور ریگ آلود روٹی کو ترجیح دیتے تھے

روزمرہ کے کام سے ہمارے اعصاب مشینوں کی طرح خود بخود
کام کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور بسا اوقات اُن کی حرکت دل و دماغ
سے محو ہو جاتی تھی۔

کام کے دوران میں ہم ایک دوسرے سے بالکل ہمکلام نہ ہوتے
کیونکہ ہمارے پاس گفتگو کے لئے کوئی موضوع ہی نہ تھا۔ اِس لئے ہمارا
تمام وقت خاموشی میں گذرتا۔ بشرطیکہ ہم میں سے کوئی کسی سے لڑ
نہ پڑے۔ مگر جھگڑے کا بہت کم موقع آتا ـــــ اور آتا بھی کیسے؟
ـــــ جبکہ انسان نیم مردہ ہو ـــــ ایک بت جس کی حسیات
شب و روز کی متواتر محنت سے کند اور مردہ کر دی گئی ہوں۔ خاموشی
اُن اشخاص کے لئے جو سب کچھ کہہ چکے ہوں۔ اور کچھ کہنے کے لئے باقی
نہ رکھتے ہوں۔ خوف اور اذیت ہے۔ مگر اُن کے لئے جو ابھی تک اپنی
آواز سے ہی نہ آشنا ہوں۔ خاموشی بجائے تکلیف دہ ہونے کے آسان
و راحت رساں ہے۔

اِس خاموشی کو کبھی کبھار ہمارا راگ توڑ دیتا ـــــ وہ راگ
اِس طرح ظہور میں آتا ـــــ ہم میں سے ایک کبھی تھکے ہوئے

گھوڑے کے ہنہنانے کی طرح کوئی ایسا راگ الاپنا شروع کر دیتا جو عموماً
ایسے موقعوں پر روح کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ پہلے پہل تو اس
اداس راگ میں کوئی شامل نہ ہوتا ـــــ اور وہ راگ ہماری زندان
نما کوٹھڑی کی چھت کے نیچے شمع کی لو کی طرح لرزتا رہتا۔ مگر تھوڑی
دیر کے بعد اِس گانے والے کے ساتھ ہم میں سے ایک اور شامل ہو
جاتا ـــــ اب دو غمگین و ہم آہنگ آوازیں ہماری قبر نما کوٹھڑی
کی کثیف فضا میں تیرتی نظر آتیں ـــــ تھوڑی دیر کے بعد ہم سب
اِس راگ میں شامل ہو جاتے ـــــ اب بہت سی آوازیں جمع ہو
کر سمندر کی موجوں کی طرح سنگین قفس کی سیاہ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا
کر گونجنا شروع کر دیتیں۔ اِس طرح ہم سب اپنے آپ کو راگ الاپنے
میں مصروف پاتے۔

ہمارے بلند راگ کے سُر جو کوٹھڑی میں آزادانہ طور پر سما نہ
سکتے تھے۔ پتھر کی سیاہ دیواروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری، نالہ فریاد
کرتے۔ اور ہمارے بے حس دلوں میں ایک ہیجان ـــــ ایک بیٹھا
سا درد پیدا کر دیتے۔ جو اُس کے مندمل زخموں کو پھر ہرا کر دیتا اور

اُسے ایک نئے الم کے لئے بیدار کر دیتا

عام طور پر گانے والا سرد آہ بھرتے ہوئے اپنا گانا بند کر دیتا اور آنکھیں بند کئے اپنے رفیقوں کے راگ کو خاموشی سے سنتا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُن کے ساتھ شامل ہو جاتا۔

اُس کی نگاہوں میں راگ کی بڑھتی ہوئی لہر ایک دور افتادہ سڑک تھی —— دور بہت دور —— ایک کشادہ سڑک۔ سورج کی جاں پرور روشنی سے منوّر جس پر وہ گامزن ہے۔ . . .

. . . .

اسی دوران میں آگ کے شعلے بھٹی میں سُرخ زبانیں نکال رہے ہوتے، نانبائی کی آہنی سلاخ بھٹی کی زرد اینٹوں پر تیز آوازیں کھیل رہی ہوتی، ابلتے ہوئے پانی کا شور بدستور جاری رہتا اور شعلوں کا عکس دیوار پر رقصاں خاموش ہنسی ہنس رہا ہوتا —— اور ہم کسی غیر کے لفظوں میں اُن انسانوں کا دکھ درد بیان کرنے میں مصروف ہوتے۔ جن سے سورج کی روشنی چھین لی گئی

ہو —— جو غلام ہوں

یہ تھی ہماری زندگی —— چھبیس غلاموں کی زندگی اِس قفس میں جس میں زندگی کے ایام اس قدر تلخ گذر رہے تھے۔ کہ معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اِس سنگین مکان کی تینوں منزلیں ہمارے کندھوں پر تعمیر کی گئی ہیں۔

گانے کے علاوہ ہمارے پاس ایک اور شغل تھا۔ جس کی ہماری نظروں میں ویسے ہی قدر و قیمت تھی۔ جیسے سورج کی دلفریب شعاؤں کی۔

ہمارے مکان کی دوسری منزل میں زری کا کارخانہ تھا۔ جس میں بہت لڑکیاں ملازم تھیں۔ ان لڑکیوں میں سولہ برس کی دوشیزہ ٹینیا نامی تھی جو ہمارے سامنے والی دیوار کی چھوٹی کھڑکی کے پاس ہر روز آتی۔ اور سلاخوں کے ساتھ اپنا گلاب ایسا چہرہ لگا کر سُریلی آواز میں پکارتی۔

"مظلوم قیدیو! مجھے تھوڑے سے بسکٹ دو"

اِس آواز کو سنتے ہی ہم سب کھڑکی کے پاس دوڑے چلے جاتے

اور اس خوبصورت اور معصوم چہرہ کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتے۔ اُس کی آمد ہمارے لئے خوشگوار ہوتی۔

اُسے کھڑکی کے پاس دیکھ کر ہم سب دروازہ کی جانب بڑھتے اور ایک دوسرے کو ریلتے ہوئے دروازہ کھول دیتے۔ دروازہ کھلتے پر وہ اندر آجاتی ——— ہمیشہ ایک ہی انداز کے ساتھ مسکراتی ہوئی، اپنے خوبصورت سر کو ایک طرف لٹکائے ہوئے جس سے بھورے بالوں کے خوبصورت گیسو عجب دلکش انداز میں اس کے شانوں پر لٹک رہے ہوتے۔

ہم غلیظ، زشت رو اور بد وضع حسرت زدہ بھکاریوں کی طرح کھڑے اس کی شکل کی طرف دیکھا کرتے جو دروازے کی دہلیز پر کھڑی محو تبسم ہوتی۔ ہم سب اُس کی خدمت میں صبح کا سلام عرض کرتے اور اُس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت خاص الفاظ استعمال میں لاتے ——— وہ الفاظ ہماری زبان سے خاص اُسی کے لئے نکلتے ——— خاص اُسی کے لئے

جب ہم اُس سے ہمکلام ہوتے تو ہماری آواز خلاف معمول

ملائم اور نرم ہوتی اور ہماری بدذوقی اس وقت بالکل غائب ہو جاتی ——— یہ آداب صرف اُسی کے لئے مخصوص تھے۔ نانبائی سُرخ اور خستہ بسکٹ نکال کر اُس کی جھولی میں عجب چابک دستی سے پھینک دیا کرتا۔

"دیکھو! خیال رہے۔ کہیں آقا کے دام میں گرفتار نہ ہو جانا"، ہم ہمیشہ اُسے اس خطرہ سے آگاہ کرتے رہتے۔

اس پر وہ دلکش ہنسی ہنستی ہوئی یہ جواب دیتی "خدا حافظ میرے ننھے قیدیو!" ——— اور یہ کہتے ہی وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جایا کرتی

اُس کی روانگی کے بعد ہم دیر تک اُس کے متعلق گفتگو کرتے ——— ہمارے خیالات ہمیشہ ایک ہی ہوتے کیونکہ وہ، ہم اور ہمارے گرد و پیش کی اشیا ہمیشہ وہی ہوتیں ——— غیر متبدل اُس انسان کے لئے زندگی ایک عذاب ہے۔ جس کا ماحول ثباتی ہو۔ جتنا عرصہ وہ اس ماحول میں بسر کریگا۔ اُسی قدر اُس فضا کا سکون اُس کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جائے گا۔

ہم صنفِ نازک کے متعلق ایسے الفاظ میں گفتگو کیا کرتے کہ بعض
اوقات وہ گفتگو ناگوارِ خاطر ہو جایا کرتی ——— اِس سے یہ نتیجہ نہ اخذ
کرلیا جائے۔ کہ ہمارے خیالات عورتوں کے متعلق اِس قدر بُرے تھے۔
وہ صف جن کے متعلق ہم اظہارِ خیالات کیا کرتے عورت کہلائے
جانے کی مستحق نہیں۔

ٹائنا کی شان میں ہمارے منہ سے کوئی گستاخ کلمہ نکلنے نہ پاتا
——— شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ہمارے پاس بہت کم عرصہ ٹھہرتی
تھی ——— وہ ہماری نظروں کے سامنے آسمان سے ٹوٹے ہوئے ستارے
کی طرح روشنی دکھلا کر پھر اوجھل ہو جاتی۔

اور یا اُس کی وجہ اُس کا حسن ہو۔ کیونکہ ہر حسین چیز انسان
کے دل میں اپنی وقعت اور عزت پیدا کر دیتی ہے ———
خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔

اِس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی۔ گو زندان ایسی مشقت نے
ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا۔ مگر ہم پھر بھی انسان تھے
——— اور بنی نوعِ انسان کی طرح ہم بھی بغیر کسی کی پرستش کئے

زندہ نہ رہ سکتے تھے

ہمارے لئے اُس کی ذات سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور شے نہ تھی
اِس لئے کہ بیسیوں انسانوں میں سے جو اِس عمارت میں رہتے۔ ایک
صرف وہی تھی۔ جو ہماری پروا کیا کرتی تھی ——— سب سے بڑی
وجہ یہی تھی۔

ہر روز اِس کے لئے بسکٹ مہیا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے ———
یہ نذرانہ ہوتا جو ہم ہر روز اپنے دیوتا کی قربانگاہ پر پیش کیا کرتے تھے۔
آہستہ آہستہ یہ رسم ایک مقدس فرض میں تبدیل ہو گئی ———
ہمارا اور اُس کا رشتہ باہم مضبوط ہو گیا۔

بسکٹوں کے علاوہ ہم ٹائنا کو نصیحتیں بھی کیا کرتے ——— یہی کہ
وہ اِس سردی میں گرم کپڑے استعمال کیا کرے۔ اور سیڑھیوں پر آرام سے
اترا کرے۔

ہماری اِن نصیحتوں کو وہ مسکراتی ہوئی سنا کرتی اور اُن پر کبھی عمل
نہ کرتی ——— اس کا یہ طرزِ عمل ہمیں کبھی ناگوار معلوم نہ ہوتا۔ کیونکہ
نصیحتوں کے پس پردہ ہماری صرف یہی خواہش ہوتی تھی۔ کہ وہ اِس

بات سے باخبر ہو جائے۔ کہ ہم اِس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

بعض اوقات وہ ہمیں کچھ کام کرنے کے لئے کہتی جسے ہم بصد خوشی ـــــــ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ کیا کرتے۔ لیکن جب ایک دفعہ ہمارے رفیق نے اُسے اپنی قمیض دے کر پیوند لگانے کو کہا۔ تو اُس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا "کیا نگوڑا یہی کام رہ گیا ہے میرے لئے ـــــــ مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں"

ہم اپنے بیوقوف ساتھی کی اِس حرکت پر خوب ہنسے اور پھر اسے کسی کام کے کرنے کو نہ کہا۔

ہمیں اُس سے محبت تھی ـــــــ اگر محبت کہا جائے تو سمجھ لیجیے کہ تمام جذبات اِسی لفظ میں نہاں ہیں۔

انسان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے۔ کہ وہ کسی کو اپنی محبت کا مرکز بنائے۔ خواہ اُس کا محبوب اُس کی محبت کے بوجھ تلے پس ہی کیوں نہ جائے۔ اِس کی تمام تر وجہ یہ ہے۔ کہ محبت کرتے وقت وہ اپنے محبوب کا احترام نہیں کرتا۔ ہم اگر ٹینیا کو محبت کرتے تھے تو مجبوری سے اِس لئے کہ ہمارے پاس کوئی اور شے موجود نہ تھی۔ جس سے ہم محبت کر سکیں۔

کبھی کبھی ہم میں سے ایک یہ سوچنے لگ جاتا۔ کہ ہم سب اُس لڑکی کے متعلق بے فائدہ سرگردانی کیوں کر رہے ہیں؟ اُس چھوکری کی محبت میں آخر ہمیں کیا ملے گا؟

اِس شخص کی جو ٹینیا کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات کہنے کی جرأت کرتا بہت بڑی حالت کی جاتی۔

ہم چاہتے تھے کہ کسی سے محبت کریں۔ اور اب چونکہ ہمیں وہ چیز جس کے ہم متلاشی تھے مل گئی تھی۔ اِس لئے ہم اِس سے الفت کرتے اور وہ چیز جسے ہم چھبیس اشخاص محبت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ امر لازم تھا کہ دوسرے اس کا احترام کریں۔ اِس لئے کہ وہ ہماری مقدس عبادت گاہ تھی۔ اور اگر کوئی شخص ہمارے نظریہ کے خلاف چلتا تو وہ ہمارا دشمن تھا اِس میں کوئی شک نہیں۔ لوگ اکثر اِس چیز کو محبت کرتے ہیں جو حقیقت میں محبت کئے جانے کے قابل نہیں ہوتی ـــــــ مگر یہاں ہم چھبیس شخص ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ اِس لئے ہم چاہتے تھے۔ کہ اِس چیز کو جسے ہم پیار کرتے ہیں۔ دوسرے مقدس خیال کریں۔ بسکٹ کے کارخانہ کے علاوہ ہمارا آقا ایک کیک بنانے والی فیکٹری کا مالک تھا

جو اُسی مکان میں واقع تھی۔ ہماری قبر نما کوٹھڑی اور اُس فیکٹری کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ اِس فیکٹری کے ملازم اپنے کام کو ہمارے کام سے اعلیٰ و مصفّا خیال کرتے ہوئے ہمیں نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے اور یہی وجہ تھی۔ کہ وہ ہمارے ساتھ بہت کم ملنے کی زحمت گوارا کرتے۔ بلکہ جب کبھی اِنہیں صحن میں ہمارے ساتھ دوچار ہونے کا اتفاق ہوتا تو وہ ہمیں دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔

ہمیں اِن کے کارخانہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ صرف اِس لئے کہ ہمارے آقا کو شبہ تھا۔ کہ ہم وہاں سے مکھن کے کیک چرا لینگے

ہمیں بھی اُن سے نفرت تھی ——— رشک تھا۔ اِس لئے کہ اُن کا کام نسبتاً کم اور مزدوری کہیں زیادہ تھی۔ اُن کے لئے خورونوش کا سامان ہم سے نہایت اچھا تھا، اُن کے کام کرنے کی جگہ روشن وصاف اور وہ ہمارے برعکس تندرست اور مصفّا تھے۔ اُن کے مقابلہ میں ہم سب زرد اور نحیف تھے۔ ہم سے تین دائم المریض اور باقی تپِ دق ایسی لرزہ خیز مرض میں مبتلا تھے ——— ہم میں سے ایک بیچارہ تو گنٹھیا کی وجہ سے قریب قریب اپاہج ہو رہا تھا۔

تعطیل کے دنوں میں وہ خوبصورت لباس اور نئے روغن شدہ بوٹ پہن کر باغ میں چہل قدمی کے لئے نکلتے ——— اور ہم چیتھڑوں میں پھٹے ہوئے بوٹ پہنے ہوئے باغ کی جانب جاتے مگر پولیس ہمیں اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیتی۔ اِن حالات کی موجودگی میں یہ کب ممکن ہو سکتا تھا۔ کہ ہم اُن کیک بنانے والوں کو محبت کی نظروں سے دیکھتے؟

چند روز ہوئے ہم نے یہ افواہ سنی کہ اُنکا منتظم شراب نوشی کی وجہ سے نکال دیا گیا ہے۔ اور اُس کی جگہ ایک اور شخص کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو کسی زمانہ میں سپاہی تھا۔

اِس سپاہی کے متعلق روائت تھی۔ کہ وہ شوخ رنگ کی واسکٹ پہنے "ایک بڑی سی سنہری زنجیر لٹکائے صحن میں گھوما کرتا ہے۔

ہم اِس نئے منتظم کو دیکھنے کے بہت شائق تھے۔ اس کی ملاقات کی اُمید میں ہم سب نے باری باری صحن میں چکر کاٹے مگر بے سود۔

ایک روز وہ خود ہی ہمارے کارخانے میں چلا آیا۔

بوٹ کی ٹھوکر سے دروازے کو کھول کر وہ دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔ اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا "خدا تمہارے ساتھ ہو! میرے بچو آداب

عرض ہے "

بھٹی کا دھواں سیاہ بادلوں کی طرح چکّر لگاتا ہوا دروازے سے گزر رہا تھا۔ جہاں سپاہی عجب پر رعب انداز میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

اِس نے اپنی مونچھوں کو کمال صفائی سے تاؤ دے رکھا تھا۔ جس میں سے زرد دانتوں کی لڑیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔

وہ آج نیلے رنگ کی ایک بھڑکیلی کامدار واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس پر سنہری بٹن جابجا چمک رہے تھے ——— سونے کی وہ زنجیر جس کے متعلق ہم نے سنا تھا بلاشک و شبہ اپنی جگہ پر موجود تھی۔

یہ سپاہی مضبوط، دراز قد اور خوبصورت تھا ——— اِس کی بڑی اور روشن آنکھوں میں دوستی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

ایک کلف شدہ ٹوپی اُس کے سر کی زینت ہو رہی تھی۔ اور اُس کے پاجامہ کے پائنچوں سے تازہ روغن شدہ بوٹ چمک رہے تھے۔

ہمارے نانبائی نے اُس کی خدمت میں مودبانہ التجا کی کہ وہ دروازہ بند کر دے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے آقا کے متعلق ہم سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ ہم نے اِن سوالات کا جواب دیتے ہوئے اُسے بتلایا کہ ہمارا آقا خون چوسنے والا پسّو، غلاموں کا تاجر انسانی اجناس فروخت کرنے والا گماشتہ اور ضرر رساں ہے ——— ہم نے اُن خیالات کا اظہار بھی کیا جو ہمیں اپنے آقا کے متعلق تھے مگر اِن کا صفحہ قرطاس پر لانا ناممکن ہے۔

سپاہی اپنے سوالات کا جواب بڑے غور سے سنتا رہا۔ مگر یک لخت جیسے وہ کسی گہری خواب سے چونک پڑا ہو کہنے لگا "تم لوگوں کے پاس چھوکریاں تو بہت ہوں گی؟"

اِس پر ہم میں سے بعض تو ہنس پڑے۔ اور بعض نے افسردہ منہ بنا لئے۔ آخر کار ہم میں سے ایک نے سپاہی پر واضح کر دیا۔ کہ ہمارے گرد و نواح میں چھوکریاں ضرور موجود تھیں ——— کوئی درجن ایک کے قریب۔

اِس پر سپاہی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا "کیا اُن سے تفریح

بھی ہوا کرتی ہے؟"

ہم پھر ہنس پڑے —— ہم میں سے اکثر اِس امر کے خواہش مند تھے۔ کہ سپاہی پر واضح کر دیں کہ وہ چھوکریاں جن کے متعلق وہ اِس قسم کی گفتگو کر رہا ہے۔ بعینہٖ اُسی کی مانند تیز و طرار ہیں —— مگر یہ بات کہنے کی ہم میں سے کسی کو جرأت نہ تھی۔ پھر بھی ہم سے ایک نے دبی زبان سے یہ کہہ ہی تو دیا۔

"اِس حالت میں جس میں ہم ہیں ——"

"درست ہے! اِس حالت میں اِس قسم کی تفریح تمہارے لئے ناممکن ہے۔ دراصل تمہیں اپنی موجودہ حالت میں نہیں ہونا چاہئے اِس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری قسمت بُری ہے —— میرا مطلب سمجھتے ہو نا؟ —— اور عورتیں! تم جانتے ہو۔ اُس مرد کو پسند کرتی ہیں۔ جو وضع دار ہو، جوان اور خوبصورت ہو۔ اِس کے علاوہ وہ مرد میں طاقت اور قوت کی بھی عزت کرتی ہیں —— اِس بازو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے"

سپاہی نے آستین چڑھا کر بازو کو کہنی تک ننگے کرتے ہوئے

کہا۔ بازو مضبوط اور سپید رنگ کا تھا۔ جس پر سنہری بال چمک رہے تھے۔

"ٹانگیں اور چھاتی بھی اسی طرح مضبوط ہے —— گوشت سے بھری ہوئی —— اب طاقت کے علاوہ مرد کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ وہ بہترین لباس زیب تن کرے —— میری طرف دیکھو تمام عورتیں مجھے محبت کرتی ہیں۔ حالانکہ میں نے اِن کے بارے میں کبھی کوشش کی ہی نہیں —— ایسی در جنوں ہیں"

یہ کہہ کر وہ ایک ٹوکری پر بیٹھ گیا اور ہمیں یہ سنانا شروع کیا۔ کہ عورتیں اِس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہوتی ہیں اور وہ اُن کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔

اُس کی روانگی کے بعد ہم عرصہ تک خاموش رہے۔ اور اِس عرصہ میں اُس کے عشق کے افسانوں کی بابت سوچتے رہے۔

اِس خاموشی کے بعد دفعتاً ہم گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ جس میں اتفاق آراء سے سپاہی کو خوش خلق اور ملنسار قرار دیا گیا۔

وہ بہت حلیم اور خوش طبع تھا۔ جبکہ اُس نے ہمارے ساتھ

اِس طرح گفتگو کی جیسے وہ ہم ایسا ہو ——— ہمارے پاس آج تک کوئی ایسا شخص نہ آیا تھا۔ جس نے ہمارے ساتھ اِس قسم کی دوستانہ گفتگو کی ہو۔

ہم عرصہ تک اِس کی مستقبل قریب میں اِن کامیابیوں کے متعلق اظہار خیالات کرتے رہے۔ جو اُسے فیکٹری میں لڑکیوں کی محبت جیتنے میں حاصل ہونی تھیں ——— اُن لڑکیوں کی محبت جو ہماری طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتیں۔ جیسے انہیں ہم سے کوئی غرض ہی نہیں اور یا جن کو ہم للچائی للچائی نظروں سے دیکھتے جبکہ وہ صحن میں مختلف قسم کے خوبصورت لباس پہن کر گذر رہی ہوتیں۔

"ٹاٹینیا کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ کہیں وہ سپاہی کی گرفت میں نہ آجائے" نانبائی نے دفعتاً دلگیر آواز میں کہا۔

اِن الفاظ نے ہم پر بہت اثر کیا۔ اِس لئے ہم خاموش رہے۔

ٹاٹینیا کا خیال ہمارے دماغوں سے تقریباً تقریباً محو ہو چکا تھا۔

سپاہی کے خوبصورت اور مضبوط جسم نے اُسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ ہم میں سے بعض کو یقین تھا۔ کہ ٹاٹینیا ایک معمولی سپاہی کی خاطر اپنی عصمت کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیگی۔ مگر بعض کا یہ خیال تھا۔ کہ وہ سپاہی کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

ہم میں سے چند ایک نے رائے دی کہ اگر سپاہی اپنی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرے۔ تو اُس کی پسلیاں کچل ڈالی جائیں۔

اِس بحث کے اختتام پر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ ہم سب ٹاٹینا کی حفاظت کریں۔ اور اُسے آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیں۔

ایک ماہ گذر گیا

سپاہی حسب معمول اپنے کام میں مشغول رہا۔ اِس دوران میں وہ ہمارے کارخانہ میں کئی دفعہ آیا۔ مگر چھوکریوں پر فتح پانے کے قصوں کی بابت ایک حرف تک زبان پر نہ لایا۔

ٹاٹینا بھی ہر روز صبح کو اپنے بسکٹوں کی خاطر آتی۔ اُس کا رویہ حسب دستور ویسا ہی دوستانہ تھا۔ ہم نے اُسے سپاہی کے متعلق

آگاہ کرنا چاہا مگر اُن ناموں سے جس سے وہ اُسے پکارتی ہمیں یقین ہو گیا۔ کہ وہ اُس کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔

ہمیں اپنی ننھی لڑکی ٹائینا پر ناز تھا۔ جبکہ ہم ہر روز سپاہی کے ساتھ کوئی نہ کوئی لڑکی دیکھتے تھے۔ ٹائینا کے اس باوقار رویہ نے ہمارے حوصلوں کو بڑھا دیا۔ اب ہم —— اس کی عصمت کے نگہبان سپاہی کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس کے برعکس اُس کی عظمت ہمارے دلوں میں دن بدن بڑھتی گئی۔

ایک روز سپاہی شراب سے مخمور ہنستا ہوا ہمارے کمرہ میں داخل ہوا۔ جب ہم نے اُس کے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا "دو چھوکریاں مجھ پر آپس میں لڑ رہی ہیں —— انہوں نے کس طرح ایک دوسرے کو ذلیل کیا —— ہاہاہا —— ایک دوسری کے بال پکڑ کر وہ زمین پر گر پڑیں —— ہاہاہا —— اور دیوانی بلیوں کی طرح نوچنا شروع کر دیا —— اور میرا ہنسی کے مارے بُرا حال ہوا جا رہا تھا —— مجھے تعجب ہے۔ کہ عورتیں صاف لڑائی کیوں نہیں لڑتیں —— نوچنے کا فائدہ ؟"

وہ بنچ پر بیٹھا ہوا کس قدر تندرست اور مصفّا نظر آ رہا تھا۔ ہم خاموش تھے۔ اِس لئے کہ اِس کی آمد ہمیں ناگوار گذر رہی تھی۔

"میں اِس معمّہ کو حل کرنے سے قاصر ہوں —— خدا جانے عورتیں مجھ پر کیوں فریفتہ ہیں —— بس آنکھ جھپکنے کی دیر ہے اور ——"

یہ کہتے وقت سپاہی اپنے سپید بازوؤں کو ہوا میں حرکت دے رہا تھا۔ اور ہماری طرف دوستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ننّھے پودوں کو اُکھاڑ لینا کوئی جوانمردی نہیں۔ مزا تو جب ہے کہ کسی مضبوط درخت کو گرایا جائے" ہمارے نانبائی نے غصّہ کی وجہ سے آہنی سلاخ کو بھٹی میں تیزی سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"تم مجھ سے مخاطب ہو گیا ؟" سپاہی نے دریافت کیا"

"ہاں! تمہیں سے مخاطب ہوں"

"اِس سے تمہارا مطلب ؟"

"کچھ بھی نہیں —— کچھ بھی نہیں"

"ٹھہرو! ٹھہرو! وہ کونسا مضبوط درخت ہے۔ جس کا تم ذکر کر رہے ہو"

نانبائی نے اِس کا جواب نہ دیا۔ اور بھٹی سے پکے ہوئے بسکٹ
نکالنے میں مشغول رہا۔ اِس سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ سپاہی اور اُس
کی گفتگو کو بالکل بھول چکا ہے۔ مگر سپاہی بہت بے چین ہوا۔ اور اپنی
جگہ سے اُٹھ کر بھٹی کے قریب آیا اور کہا:۔

"کہو تو! ——— کس عورت کا ذکر کر رہے تھے؟ ———
تم نے میری ہتک کی ہے کوئی عورت مجھ پر غالب نہیں آسکتی"

اُس کی گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ نانبائی کی گفتگو سے سخت
ناراض ہو گیا ہے۔ اغلباً اُس کو اس بات پر بہت فخر تھا۔ کہ اس میں
عورتوں کو مسخر کرنے کا وصف موجود ہے۔ ورنہ در حقیقت سوائے اِس
وصف کے اِس شخص میں زندگی کے متعلق کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ اسی
ایک رہے سہے وصف کی رو سے وہ اپنے آپ کو زندہ انسان کہلانے
کا مستحق ہو سکتا تھا۔

دنیا میں ایسے افراد موجود ہیں۔ جو بیماری کو خواہ وہ روحانی ہو یا
جسمانی زندگی کا ایک بیش قیمت جزو سمجھتے ہوئے اُس کی تمام زندگی
بھر پرورش کرتے رہتے ہیں۔ اور اُسی میں اپنی زندگی کا راز سمجھتے ہیں

حالانکہ ایسی زندگی عموماً تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر وہ اِس پر از مصائب
زندگی کے متعلق دوسروں سے شکائیت ضرور کرتے ہیں۔ صرف اِس
لئے کہ اپنے ہمسایہ انسانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ اور اِس
طرح وہ انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھیں۔

اگر ایسے افراد سے یہ بے چینی، کرب اور تکلیف چھین لی جائے
اُن کے درد کی دوا کر دی جائے۔ تو وہ پہلے کی طرح شادمان نہ ہوں
گے۔ اِس لئے کہ اُن کی زندگی کا آخری سہارا اُن سے علیحدہ کر دیا گیا
ہے ——— اب وہ کھوکھلے برتن کی مانند ہو گئے۔ بعض اوقات
ایک انسان کی زندگی اِس قدر تنگ اور غربت زدہ ہوتی ہے۔ کہ وہ
بے قصد کسی معیوب چیز کو ہی محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اِسی
پر زندہ رہنا چاہتا ہے۔ صاف لفظوں میں اکثر لوگ صرف دماغی
بے کاری کی وجہ سے گناہ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

سپاہی سخت ناراض ہو گیا تھا، نانبائی کی طرف لپکا اور درشت
لہجہ میں بولا "میں جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ بولو ——— کس لڑکی کی
بابت ذکر کر رہے ہو"

"کہوں پھر" نانبائی نے سپاہی کی طرف اچانک مڑتے ہوئے کہا

"ہاں! ہاں"

"کیا تم نائینا کو جانتے ہو"

"کیوں؟"

"بس وہی لڑکی ہے ——— قابو میں لانے کی کوشش کرو"

"میں؟"

"ہاں! ہاں! تم!"

"یہ تو بالکل معمولی بات ہے"

"ہم بھی دیکھیں کیسے؟"

"تو پھر دیکھ لو گے ——— ہا ہا ہا!"

"وہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے گی"

"صرف ایک ماہ کی مہلت چاہتا ہوں"

"شیخ چلی مت بنو ——— میاں سپاہی"

"اچھا چودہ روز سہی ——— اس کے بعد تم دیکھ لینا ——— کیا نام لیا تھا تم نے؟ ——— نائینا؟"

"اب جاؤ ——— تم کام میں حارج ہو رہے ہو"

"بس چودہ روز ——— اور وہ میرے قابو میں ہو گی ——— تمہاری قسمت!!"

"میں کہتا ہوں یہاں سے دور ہو جاؤ"

یہ کہہ کر نانبائی وحشیوں کی طرح غضبناک ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سپاہی سخت حیران ہوا اور خاموشی سے یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا "بہت اچھا"

اس بحث کے دوران میں ہم سب خاموش رہے۔ اس لئے کہ ہم اُن کی باہم گفتگو کو بہت غور سے سن رہے تھے، لیکن جونہی سپاہی رخصت ہوا ہمارے درمیان گفتگو کا ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ ہم میں سے ایک نے نانبائی کو چلاتے ہوئے کہا "تمہیں یہ کیا شرارت سوجھی ہے" "کام کیئے جاؤ اپنا ——— سنا ہے یا نہیں" نانبائی نے تندی سے جواب دیا۔

ہمیں دراصل اس امر کی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ کہ چونکہ سپاہی اپنے الفاظ کو پورا کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اس لئے نائینا کی

عصمت خطرے میں ہے۔

مگر باوجود اس کے ہم اس بحث کا نتیجہ دیکھنے کے لئے سخت بیقرار تھے ــــــ اُس بحث کا نتیجہ جو کسی حالت میں بھی خوشگوار نہ تھا۔

"کیا ٹاٹیانا سپاہی کے مقابلہ کی تاب لاسکیگی" اس سوال پر ہم سب بیک زبان چلا اٹھے۔ جیسے ہمیں ٹاٹیانا پر پوری طرح بھروسہ ہو "ننھی ٹاٹیانا ضرور ثابت قدم رہیگی"

ہمیں اپنے ننھے دیوتا کی ثابت قدمی و استقلال کے امتحان لینے کی عرصہ سے خواہش تھی۔ لیکن اب ہم نے آپس میں یہ ثابت کر دیا۔ کہ ٹاٹیانا اس امتحان میں ضرور سرخرو ہوگی۔ اُس دن سے ہماری زندگی ایک عجیب قسم کی زندگی ہوگئی۔ جس سے ہم بالکل ناآشنا تھے۔ ہم آپس میں ہر دن بحث کرتے رہتے تھے۔ جیسے ہم پہلے کی نسبت زیادہ عقلمند و ذی فہم بن گئے ہوں۔ اور ہماری گفتگو کچھ معنے رکھتی ہو اب ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ ہم شیطان سے بازی لگا رہے ہیں۔ اور ٹاٹیانا کی عصمت ہماری طرف سے داؤ ہو۔

جب ہم نے کیک بنانے والے نانبائی سے یہ خبر سنی۔ کہ سپاہی نے ٹاٹیانا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تو ہمیں سخت رنج پہنچا اور ہم اس رنج کو مٹانے کے لئے اس قدر منہمک تھے۔ کہ ہمکو یہ معلوم تک نہ ہوا۔ کہ آقا نے ہماری بے چینی و اضطراب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدہ میں تین سیر کا اضافہ کر دیا ہے۔

اس اضطراب کے دوران میں کام کرتے ہوئے ٹاٹیانا کا نام ہر وقت ہماری ورد زبان ہوتا۔ اور ہم ہر روز صبح کو اس کا انتظار کیا کرتے ــــــ غیر معمولی بے صبری کے ساتھ

وہ ہر روز ہمارے پاس آتی مگر ہم نے سپاہی والی تکرار کا اس کے ساتھ ذکر تک نہ کیا۔ اور نہ ہی اُس سے کسی قسم کے سوالات کئے۔ بلکہ حسب معمول جذبہ الفت سے ملتے رہے۔ مگر اس جذبہ الفت میں کسی نئی چیز کی جھلک تھی ــــــ تیز تجسّس کی جھلک ــــــ خنجر کے پھل کی مانند تیز اور سرد۔

دوستو! میعاد کا وقت آج کے روز پورا ہو جائے گا" نانبائی نے صبح کے وقت کام شروع کرتے ہوئے کہا۔

ہمیں مطلع کرنے سے پیشتر ہی اِس امر کا علم تھا۔ مگر پھر بھی یہ سن کر ہم سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔

"وہ ابھی ابھی آئی تھی ——— ذرا غور سے دیکھنا اُسے" نانبائی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے ——— آنکھیں کچھ بتا سکیں گی" ہم میں سے ایک نے پرسوز لہجہ میں کہا۔ اِس پر بحث چھڑ پڑی۔ آج کے روز ہمیں معلوم ہو جانے والا تھا۔ کہ وہ برتن جس میں ہم سب نے اپنے دل رکھے ہوئے ہیں۔ کتنا صاف و بے لوث ہے۔ صرف آج کی صبح ہم کو ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے ہم کوئی بڑی کھیل کھیل رہے ہوں۔ جس میں ہمیں اپنے معبود کے کھو جانے کا اندیشہ ہو۔

گذشتہ چند دنوں سے ہم سن رہے تھے۔ کہ سپاہی حصولِ مقصد کے لئے ٹائنا کے پیچھے سایہ کی طرح لگا ہوا ہے۔ ٹائنا حسبِ معمول بسکٹوں کے لئے ہر روز آتی مگر ہم اُس سے سپاہی کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کرتے ——— ہم خود متعجب تھے کہ کیوں؟

آج کے روز بھی ہم نے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا "ننھے قیدیو ———

تیں آ گئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ اِس پر ہم سب آ گئے۔ اور جب وہ اندر آ گئی تو ہم خلافِ معمول اُسے خاموشی سے ملے گو ہماری آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر ہمیں معلوم نہ تھا۔ کہ سلسلہ کلام کیونکر شروع کریں ——— ہم خاموشی اور حیرت کی تصویر بنے اِس کے سامنے کھڑے تھے اِس انوکھے اور خلافِ معمول استقبال کو دیکھ کر وہ سخت حیران ہو گئی ——— اچانک اِس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا ——— بے چین و مضطرب دھیمی آواز میں کہنے لگی:

"تمہیں آج کیا ہو گیا ہے؟"

"تم اپنی سناؤ" نانبائی نے دردانگیز لہجہ میں کہا

"اپنی؟ ——— کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ بھی نہیں ——— کچھ بھی نہیں"

"تو چلو مجھے بسکٹ دو ——— ذرا جلدی کرو"

اِس سے قبل اِس نے آج تک اتنی پھرتی نہ دکھائی تھی

"تم جلدی کر رہی ہو" نانبائی نے ٹائنا سے آنکھیں جدا نہ کرتے ہوئے کہا۔ اِس پر وہ دفعتاً مڑی اور دروازہ سے باہر بھاگ گئی۔

نانبائی نے اپنی سلاخ پکڑی اور بھٹی کی طرف جاتے ہوئے دبی
زبان میں کہنے لگا "

اِس کا مطلب ہے ——— کہ وہ اب اُس کی ہے ———
آہ! یہ سپاہی ——— حرامزادہ ——— بدمعاش "

اِس پر ہم بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح اپنے شانوں کو ہلاتے ہوئے
میز کی طرف بڑھے اور خاموشی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

"لیکن کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے ——— ؟" ہم میں سے کسی
نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بس! بس ——— بولنے کی کیا ضرورت ہے" نانبائی
نے چیختے ہوئے جواب دیا۔ ہمیں معلوم تھا۔ کہ نانبائی عقلمند ہے ———
ہم سے کہیں زیادہ عقلمند۔ اِس لئے اِس کے چلاّنے سے ہم نے
اندازہ لگا لیا کہ وہ سپاہی کی فتح و کامیابی کا اعتراف کر رہا ہے۔

یہ خیال کرتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مصیبت زدہ اور بے چین
پاتے۔

بارہ بجے یعنی دوپہر کے کھانے کے وقت سپاہی آیا اور حسب

معمول خوش و خرم ہماری نظروں سے نظریں ملا کر دیکھنے لگا "معزز
دوستو! اگر چاہتے ہو کہ میں تمہیں آج اپنی کامیابی کا نمونہ دکھلاؤں
——— تو صحن کے ساتھ والے کمرہ میں جا کر کھڑکیوں میں سے
جھانک کر دیکھو ——— سمجھ گئے ؟" سپاہی نے پر فخر لہجہ میں ہنستے
ہوئے کہا۔

سپاہی کے کہنے پر ہم صحن کے ملحقہ کمرہ میں چلے گئے اور اپنے
چہرے کھڑکیوں کے روزنوں کے ساتھ جما دئے۔

ہمیں بہت عرصہ تک انتظار نہ کرنا پڑا کیونکہ جلد ٹائنا تیز
قدم اٹھاتی ہوئی صحن کے چھپڑوں کے پاس سے جو کہ کیچڑ اور برف سے
بھرے ہوئے تھے گذری ——— اُس کے چند منٹ بعد سپاہی
نمودار ہوا۔ جس کا رخ ٹائنا کی طرف تھا۔ بڑے کوٹ کی جیب میں
ہاتھ ڈالے، سیٹی بجاتا ہوا وہ بھی ٹائنا کی طرح ہماری آنکھوں سے
اوجھل ہو گیا ——— اِسی اثنا میں بارش شروع ہو گئی۔ اور ہم
بارش کے قطروں کو جو چھپڑوں میں گر کر عجب شور پیدا کر رہے تھے
خاموشی سے دیکھنے لگے۔

بارش کی وجہ سے آج کا دن بہت اُداس اور مرطوب تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اور زمین کیچڑ سے لت پت ہو رہی تھی۔

بارش سسکیاں بھرتی ہوئی زمین پر گر رہی تھی۔

گو ہمیں اِس سردی میں اِس طرح کھڑے رہنا ناگوار گذر رہا تھا۔ مگر چونکہ ہم ٹاآنا کی بیوفائی پر سخت برانگیختہ تھے۔ کہ اِس نے ایک معمولی سپاہی کی خاطر ہم سب کو چھوڑ دیا۔ اِس لیئے ہم جلادوں کی سی ہولناک خوشی سے اُس کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑے عرصہ بعد ٹاآنا واپس آئی ——— اُس کی آنکھیں ——— ہاں اُس کی آنکھیں کسی نامعلوم خوشی و انبساط سے چمک رہی تھیں، ——— اُس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

وہ جھومتی ہوئی چلی آ رہی تھی جیسے خواب میں ہو۔

ہم اِس منظر کو خاموشی سے نہ دیکھ سکے۔ اِس لیئے دروازہ سے نکل کر صحن کی طرف دیوانہ وار بھاگتے ہوئے گئے۔ اور اُس پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ہم کو اِس حالت میں دیکھ کر وہ کانپی

اور ٹھہر گئی۔ جیسے وہ کیچڑ میں گر پڑی ہو۔ ہم سب اُس کے گرد جمع ہو گئے اور بغیر کچھ کہے سنے جی بھر کے لعن طعن کی اور شرم ناک سے شرم ناک گالیاں سنائیں۔ ہم نے ایسا کرتے وقت اپنی آوازوں کو شور میں نہ پڑھنے دیا۔ بلکہ اُس موقع سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتے رہے کیونکہ ہمیں یقین تھا۔ کہ ہمارے درمیان گھری ہوئی وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ اور ہم جتنا عرصہ چاہیں۔ اپنے دل کا بخار نکال سکتے ہیں۔

اگر حیرانی ہے۔ تو اِس بات کی کہ ہم نے اُسے مار پیٹ کیوں نہ کی

وہ ہمارے درمیان گھری ہوئی گالیوں کو خاموشی سے سن رہی تھی ——— اور ہم گالیوں اور طعنوں کے ذریعہ اپنی آگ اُگل رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اِس کے چہرہ کا رنگ اُتر گیا ——— اُس کی نیلگوں آنکھیں جو کچھ عرصہ پہلے فرطِ مسرت سے چمک رہی تھیں اب پھٹی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، اِس کی چھاتی بڑے زور سے متلاطم تھی۔ اور اِس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے ——— اور ہم اِس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنی انتقام کی آگ بجھا رہے تھے۔

اس لئے کہ اس نے ہمیں دھوکہ دیا تھا۔

وہ ہماری تھی چنانچہ ہم نے اُس کی خدمت اپنے اپنے دل بخش کئے ——— گو وہ بھکاری کے ٹکڑے سے زیادہ قیمتی نہ تھے۔ مگر اس نے چھبیس دلوں کو ایک سپاہی کی خاطر ٹھکرا دیا۔ ہم اُسے بُرا بھلا کہ رہے تھے اور وہ خاموشی سے ——— ایک تعاقب زدہ شکار کی پھٹی ہوئی آنکھوں سے، سرتاپا ارتعاش ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس موقع پر اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔

ہم میں سے ایک نے ٹانیا کی آستین پکڑ کر کھینچ لی۔ جس پر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اور اپنے سر کو ذرا اوپر اٹھا کر بالوں کو سنوارتے اور ہماری طرف گھورتے ہوئے دفعتاً بولی "اونہہ ——— جیل کے ذلیل پرندے"

یہ کہتی ہوئی وہ ہمارے پاس سے بغیر کسی جھجک کے گذر گئی جیسے ہم اس کے راستہ میں حائل ہی نہ تھے ——— اُس کی اس دلیری نے ہمیں اس بات کی جرأت نہ دی۔ کہ ہم اُسے روک

لیں۔

ہمارے پاس سے گزرتی ہوئی وہ حقارت آمیز لہجہ میں بولی، "کمینہ اور ناپاک انسان"

یہ کہتے ہوئے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور ہم صحن میں کیچڑ اور برف کے تودوں کے درمیان، گرتی ہوئی بارش، سورج سے محروم آسمان تلے کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم خاموشی سے اپنے سنگین قفس میں چلے آئے۔ جہاں سورج کی جاں بخش شعاعیں حسب معمول ہم تک کبھی نہ پہنچیں ——— ٹانیا پھر کبھی نہ آئی

(۱) پتھر کی سرگذشت

(۲) مساوات

سلوگب

پتھر کی سرگذشت

شہر میں پتھر کی ایک سڑک تھی۔

گزرتی ہوئی گاڑی کے پہیے نے ایک پتھر کو دوسرے پتھروں سے جدا کر دیا۔ اُس پتھر نے دل میں سوچا "مجھے اپنے ہمجنسوں کے ساتھ موجودہ حالت میں نہیں رہنا چاہیئے۔ بہتر یہی ہے کہ میں کسی اور جگہ جا کر رہوں"

ایک لڑکا آیا اور اُس پتھر کو اُٹھا کرلے گیا۔

پتھر نے دل میں خیال کیا "میں نے سفر کرنا چاہا تو سفر بھی نصیب ہو گیا ——— صرف آہنی ارادہ کی ضرورت تھی" لڑکے نے پتھر کو ایک گھر کی جانب پھینک دیا۔

پتھر نے خیال کیا "میں نے ہوا میں اڑنا چاہا تھا۔ یہ خواہش بھی پوری ہو گئی ——— صرف ارادہ کی دیر تھی" پتھر کھٹ سے کھڑکی کے شیشہ پر لگا۔

شیشہ یہ کہہ کر چکنا چور ہو گیا "بدمعاش ——— ایسا کرنے

سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

تم نے بہت اچھا کیا جو میرے راستے سے ہٹ گئے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے راستے میں حائل ہوں" ہر ایک چیز میری مرضی کے مطابق ہونی چاہیئے۔ یہ میرا اصول ہے "

یہ کہہ کر پتھر ایک نرم بستر پر جا پڑا۔

پتھر نے بستر پر پڑے ہوئے خیال کیا " میں نے کافی سفر کیا ہے۔ اب ذرا دو گھڑی آرام تو کر لوں "

ایک نوکر آیا اور اس نے پتھر کو بستر پر سے اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔

سڑک پر گرتے ہی پتھر نے اپنے ہمجنسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا " بھائیو! خدا تمہیں سلامت رکھے ——— میں ابھی ابھی ایک عالیشان عمارت سے ہو کر آ رہا ہوں۔ لیکن اس کی شان و شوکت مجھے بالکل متاثر نہ کر سکی۔ میرا دل عام لوگوں کی ملاقات کے لئے بے تاب تھا۔ چنانچہ اب میں واپس آ گیا ہوں "

مساوات

ایک بڑی مچھلی نے ایک ننھی سی مچھلی کو پکڑ لیا۔ اور اُسے نگل جانا چاہا۔

" ننھی مچھلی نے چلا کر کہا " یہ سراسر بے انصافی ہے۔ میں تمہاری طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ قانون کی نظر میں ہم سب مچھلیاں یکساں ہیں "

بڑی مچھلی نے جواب دیا " میں تم سے اس بات پر ہرگز بحث کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کہ ہم سب ایک ایسے ہیں۔ اگر تم میرا شکار ہونا پسند نہیں کرتیں۔ تو آؤ مجھے اپنا شکار بنا لو۔

آؤ نا! مجھے نگل لو۔ ڈرتی کا ہے کو ہو "

چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی کو نگلنے کیلئے منہ کھولا مگر بے سود۔

آخر کار تنگ آ کر کہنے لگی " آؤ مجھے نگل لو "

(سلوگب)

"جادوگر"

"جادوگر"

شہر میں سخت بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ہڑتال پہ ہڑتال ہو رہی
تھی۔ یہ فتنہ کارخانوں سے شروع ہوا۔ اور آہستہ آہستہ آگ کی طرح شہر
کے ہر گوشہ میں پھیل گیا

اس شورش کو فرو کرنے کے لئے پولیس ہر ممکن کوشش کو عمل میں لائی
مگر بے سود۔ وہ شورش مٹنے والی نہ تھی۔

شہر اگرچہ پہلے کی طرح گوناگون دلچسپیوں کا مرقع تھا۔ اس کے
بازاروں میں ویسی ہی رونق قائم تھی۔ اور خرید و فروخت حسب معمول
جاری تھی۔ مگر بایں ہمہ کوئی شخص بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ کہ شہر
میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ رہی ہے۔ اور معمولی سے معمولی واقعہ ایک
عظیم ہیجان کا موجب بن رہا ہے ——— برقنداز کی سیٹی کی
آواز لوگوں کے دلوں پر بہت ہیبت طاری کر دیتی تھی۔

اکثر لوگ تو سیٹی کی آواز سن کر دوڑ جاتے۔ کہ دیکھیں کیا ماجرا ہے
مگر بعض اپنے آپ کو دکانوں میں چھپا لیتے ——— مگر وہ آخر کس سے

چھپ رہے تھے؟ ——— وہ کونسی شے تھی۔ جو انہیں اِس قدر خوفزدہ کر رہی تھی؟ لیکن یہ کسی شخص کو معلوم نہ تھا۔ اور پھر بھی ہر شخص کو ڈر تھا کہ کوئی خوفناک اور ہیبت ناک واقعہ ضرور پیش ہو کر رہیگا۔

عموماً چیتھڑوں میں ملبوس مزدور بازار میں کھڑے دبی زبان میں باتیں کرتے نظر آتے راستہ چلتے ہوئے وہ امیر لوگوں کی طرف حقارت اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے مگر وہ اِن کے زرد اور غلیظ چہروں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

ایسے شخص اپنے بھدے چہروں اور غلیظ لباس سے اِن بازاروں کی خوبصورتی کو جو بہار کے جاں آفریں موسم میں عروسِ نو بہار کی طرح سجے ہوئے تھے ملوث کر رہے تھے۔ یہ عجیب شخص ناخواندہ مہمانوں کی طرح شہر کے بارونق بازاروں میں آوارہ چکر لگاتے۔ مگر ان سے کوئی شخص ہمکلام نہ ہوتا کہ مبادا اُس سے اِن کے جسم بھی ویسے ہی غلیظ ہو جائیں۔ لیکن جونہی کسی برقنداز کی ان پر نگاہ پڑ جاتی وہ لوگوں کے دلوں میں ارتعاش خفی پیدا کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں بھاگ جاتے تھے

"امی یہ مزدور ہیں کیا؟"

"ہاں! ہاں! لیکن تم چلتے جاؤ اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو"

"لیکن امی وہ بھاگ کیوں رہے ہیں؟"

"پولیس سے ——— دیکھو اب ایسی باتیں نہ کرو"

"لیکن کیوں؟ ——— کیا انہیں سڑکوں پر چلنے کا حکم نہیں؟"

"نہیں اجازت نہیں"

"انہیں اجازت کیوں نہیں؟"

"خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو ——— اپنا ہاتھ مجھے پکڑاؤ اور جلدی جلدی چلنے کی کوشش کرو ——— نہیں تو ہمیں بھی کسی برقنداز کا کوڑا ———"

سرگی نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اِس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ مزدوروں کے گروہ کے منتشر ہونے پر ماں سخت خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اِس کی اِس وقت صرف یہی خواہش تھی۔ کہ کسی طرح وہ اپنے مکان میں پہنچ جائے۔

"کیا یہ مزدور شریر ہیں امی ؟"

"کون ؟ —— کون ؟"

"مزدور"

"مجھے معلوم نہیں —— وہ اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی ——
مگر وہ کام ہی نہیں کرتے"

"کیا وہ مست ہیں ؟"

"ہاں ! ہاں ! —— مگر تم ٹھہرو مت —— اور اُن کی طرح
مست نہ بنو"

"کیا وہ بُرے ہیں امی ؟"

"وہ ابھی جواب بھی نہ دینے پائی تھی۔ کہ چند گھوڑا سوار سپاہی بازار
میں نمودار ہوئے۔ اِن میں سے ایک نے اپنے گھوڑے کے ایک کوڑا
رسید کیا —— کوڑے کی آواز سرگ کی ماں کے کانوں میں اِس
طرح گونجی جیسے بندوق کی آواز —— وہ چلائی اور بغیر کرایہ طے کئے
سرگ کو ایک گاڑی میں دھکیل کر کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ
لہجہ میں کہا "جلدی کرو —— جہاں تک جلدی ہو سکے"

"مگر کہاں ۔ مادام" کوچوان نے مودبانہ کہا۔

"تم سیدھے چلے چلو —— آہ میرے خدا . . . . . جلدی چلو"

"خوف مت کیجیے مادام! وہ ہمیں ہاتھ تک نہیں لگائیں گے"

جب گاڑی بازار کا پہلا موڑ مڑی تو سرگ کی ماں کی جان میں جان
آئی۔ اور اطمینان کا سانس لے کر بولی۔

"دیکھو —— میں تمہیں ساڑھے چار آنہ سے زیادہ کرایہ نہیں
دینے کی"

"مگر یہ کرایہ مناسب نہیں محترمہ!"

"تو پھر گاڑی ٹھہرالو —— ہم ٹریم کار میں گھر چلے جائیں گے"

بہت بہتر مادام —— مگر مجھے ڈر ہے۔ کہ آپ کو بے فائدہ
وقت ضائع کرنا پڑے گا —— ٹریم کاریں آج نہیں چلیں گی"

"کون کہتا ہے ؟"

"میں نے کل سنا تھا۔ کہ ٹریم کار چلانے والے مزدور ہڑتال کر
رہے ہیں"

اسی اثنا میں مزدوروں کا ایک گروہ گاڑی کے قریب سے گزرا

سرگئی کی ماں پھر خوفزدہ ہوگئی۔ اور کوچوان کو اشارہ کیا۔ کہ وہ گاڑی کو پھر چلادے۔

سرگئی اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا اس گروہ کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ پولیس ان لوگوں کے پیچھے اتنی سرگرداں کیوں ہو رہی ہے۔ اگر وہ کام نہیں کرتے ـــــ تو نہ کریں ـــــ کچھ عرصہ کے بعد بھوک سے تنگ آکر خود ہی سرنگوں ہو جائیں گے"

"آپ درست فرما رہی ہیں مادام! ـــــ آپ ایک حیوان کو فاقہ کشی کے حربہ سے مطیع کر سکتے ہیں، اور یہی حربہ انسان کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر ایک غریب انسان کو اس طرح آزار پہنچانا گناہ ہے ـــــ گناہِ کبیرہ!" کوچوان نے اپنی گھنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر کوچوان پھر سرگئی کی ماں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "دیکھئے! آپ ایک قیمتی چغہ پہنے ہوئے ہیں۔ اور میں ایک بھدا کوٹ۔ مگر یہ بتلائیے۔ ان دونوں چیزوں کو تیار کرنے والا

کون ہے؟"

"اس کے متعلق زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے پاس بھی روپیہ ہو تو تم بھی ایسے قیمتی کپڑے پہن سکتے ہو ـــــ اگر ہمارے آدمی کام نہیں کریں گے۔ تو کیا غیر ممالک سے چیزیں منگائی نہیں جا سکتیں؟"

"لیکن اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو گئے تو ـــــ یعنی اگر ریلوے کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی۔ تو پھر آپ وہ چیزیں کہاں سے منگوائیں گے؟"

"ایسا خیال کرنا محض بے وقوفی ہے ـــــ گورنمنٹ بھلا کیا ایسا کرنے کی اجازت دے گی"

"معلوم نہیں مادام! مگر میں نے سنا ہے۔ کہ ریل والے بھی عنقریب ہڑتال کرنے والے ہیں"

سرگئی، ماں اور کوچوان کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ یہ سب کچھ سن کر سخت حیران تھا۔ کہ وہ لوگ جو دوسروں کے لئے کپڑے اور دیگر اشیا تیار کرتے ہیں۔ بازاروں میں پولیس سے

اِس طرح کیوں بھاگے پھرتے ہیں۔

اِس کی ماں نے ابھی ابھی اُسے ایک نیا کوٹ خرید کر دیا تھا جو اِس وقت اِس کے گھٹنوں پر کاغذ میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ سرگئی بہت خوش تھا۔ کہ اِس کی ماں نے اُسے یہ کوٹ اِس وقت سے پہلے ہی خرید کر دیا۔ جبکہ وہ وقت آ رہا تھا۔ کہ کپڑے تیار ہونے بھی بند ہو جاتے۔

"امّی! کیا میرا نیا کوٹ بھی انہوں نے ہی تیار کیا ہے؟"

"ہر ایک چیز ——— ننھے میاں! ہر ایک چیز انہی کی تیار کردہ ہے ——— آپ کے جسم پر کوئی بھی ایسی شے نہیں۔ جو انہوں نے تیار نہ کی ہو" کوچوان نے بجائے ماں کے جواب دیا۔ ماں نے سرگئی کے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے سخت غصّہ کے لہجہ میں کہا "زیادہ بک بک نہ کرو سرگئی! تمہیں کوچوان سے گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔"

مگر کوچوان چپ نہ ہوا۔ اور اُس موضوع پر دیر تک اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔ معلوم نہیں وہ تمہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے۔" سرگئی کی ماں نے کوچوان سے مخاطب ہو کر کہا۔

اِس پر کوچوان چپ ہو گیا۔ اور تمام راستہ اِس بارے میں کوئی گفتگو نہ کی۔

سرگئی خیالات کا ہجوم لئے گھر میں داخل ہوا۔ وہ ہنوز یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ مزدور بُرے ہیں یا اچھے۔

"سونیا! آج ہم نے مزدور دیکھے ——— مزدور" سرگئی نے اپنی بہن کو پُراسرار لہجہ میں کہا۔

"وہ کس شکل کے ہیں سرگئی؟"

"وہ ——— وہ کسانوں کی طرح ہیں میرے خیال میں"

گھر میں اُن شخصوں کی بابت جنہوں نے کارخانوں اور فیکٹریوں کو بند کر دیا تھا۔ اور کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہر روز گفتگو ہوتی مگر سرگئی اِس گفتگو سے بھی کوئی نتیجہ برآمد کرنے میں قاصر رہا۔ وہ تا حال وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ آیا وہ لوگ اچھے ہیں یا بُرے۔

ایک روز اِس نے اپنے خادم آگنیش سے دریافت کیا "کیا یہ لوگ کارخانہ کو بند کر سکتے ہیں؟"

"بہت آسانی سے ننھے آقا!"

"لیکن کس طرح؟"

"بس وہ کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں"

"لیکن ان کے بغیر کارخانہ چل ہی نہیں سکتا کیا؟"

"کارخانے کس طرح چلیں ننھے آقا! جبکہ ان کے بغیر کوئی کام ہی نہیں ہو سکتا"

"اچھا تو یہ بات ہے؟ ——— اسی طرح میرا نیا کوٹ بھی ان کے بغیر نہ تیار ہو سکتا"

"یقیناً"

"اور میرا چھوٹا کوٹ بھی"

"چھوٹا کوٹ، پاجامہ اور قمیض بھی ——— اگر وہ یہ سب چیزیں تیار نہ کرتے تو آپ ویسے ہی ہوتے جیسے قدرت نے آپ کو پیدا کیا تھا"

بالکل عُریاں؟ ——— بے وقوف آدمی ——— مگر میری امّی مجھے دوسرے ملک سے کپڑے منگوا دیتی"

"مگر اس طرح تمہیں بہت انتظار کرنا پڑتا ——— لیکن اگر

وہاں بھی اسی طرح ہڑتال ہوتی یا اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو جاتے تو ——— ؟"

"ریل گاڑیاں بھی بند ہو جائینگی کیا؟"

"افواہ تو ایسی ہی ہے"

"تو پھر میرے ابا کس طرح آئیں گے؟ ——— میں انہیں کس طرح مل سکوں گا؟"

"اس حالت میں انہیں پیدل سفر کرنا پڑے گا"

"خبردار جو ایسی بات کہی! میں امّی کو کہہ دوں گا۔ کہ تم میرے ابا کی نسبت ایسے الفاظ استعمال کر رہے تھے"

یہ کہہ کر سرگؔ تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گیا۔ اور کچھ سوچنے لگا ——— لیکن چند منٹ کے بعد اپنے کوٹ کی آستین کو پکڑ کر کہنے لگا "اور تم کہو گے یہ آستین بھی انہی کے ہاتھ کی سلی ہوئی ہے"

"کیوں نہیں؟ ——— تمہاری والدہ نے صرف تمہیں جنم دیا ہے باقی ——— "

. . . .

دو دِن کے بعد ٹریم کاریں چلنی بند ہو گئیں، اخبار شائع نہ ہوئے، غسل خانوں پر قفل لگ گئے، وہ بازار جو گیس سے بقعہ نور بنے ہوئے ہوتے تھے۔ سخت تاریک ہو گئے۔ اِس کے دو دن بعد ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بھی یک لخت بند ہو گئی۔ جس سے شہر میں سخت ہیجان برپا ہو گیا۔ اور لوگ اپنے عزیز و اقربا کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

سرگئی کا ابا کبھی کا گھر آگیا ہوتا۔ مگر گاڑیوں کے بند ہو جانے کی وجہ سے گھر نہ پہنچ سکا۔ اِس واقعہ نے گھر بھر کو سخت بے جان کر دیا تھا۔ سرگئی کو صحن میں کھیلنے کی اجازت نہ تھی۔ اِس لیے وہ سارا دن کھڑکی میں بیٹھا بازار کے واقعات کو غور سے دیکھتا رہتا

"کیا ابا گھر نہیں آئینگے امی؟"

"وہ مجبور ہیں سرگئی ——— گاڑیوں کی آمد و رفت ہی بند ہے"

"امی! کیا یہ مزدور لوگ جو چاہیں کر سکتے ہیں؟"

"کیا؟"

"میرا مطلب ہے کہ آیا یہ لوگ گاڑیوں کی آمد و رفت بھی بند کر سکتے ہیں"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے ——— مگر تم اب مجھے ستاؤ مت!

اتنا کہتے ہوئے سرگئی کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ——— یہ دیکھ کر سرگئی خاموش ہو گیا۔ اور پھر کھڑکی سے بازار کو حیران و پریشان نگاہوں سے دیکھنے لگ گیا۔

"اگر میرے بس میں ہو تو میں اِن مزدوروں کو ایک ایک کر کے ہلاک کر ڈالوں" اِس نے اپنے دل میں کہا۔

شہر کی حالت لحظہ بہ لحظہ بد سے بدتر ہو رہی تھی ——— حالات پہلے کی نسبت زیادہ بدل رہے تھے ——— اب بازاروں میں وہ پہلی سی رونق نہ تھی ——— بہت سی دکانوں پر تالے پڑے ہوئے تھے ——— رات کے وقت مسلح پولیس گشت لگاتی تاکہ شہر میں کوئی شورش برپا نہ ہونے پائے۔

ایک روز نصف شب کے قریب بازار میں اس قدر شور

ہوا کہ سرگ اپنے بستر سے برہنہ پا بھاگ کر کھڑکی کے پاس دوڑا ہوا گیا
تاکہ معلوم کرے وہ شور کیسا ہے۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ بازار میں آگ کا الاؤ
جل رہا ہے۔ جس کے ارد گرد لوگ وحشیوں کی طرح چل پھر رہے ہیں
سرگ نے سوچا کہ یہ چیزیں کسی خوفناک واقعہ کی پیش خیمہ ہیں
اِس خیال نے اِس کی رگوں میں خون منجمد کر دیا۔ یہ خیال کر کے کہ وہ جن
بھوتوں کی طرح اُسے آگ پر بھون کر کھا جائیں گے۔ وہ اِس قدر خوفزدہ
ہوا کہ چلا اٹھا" امّی! امی! مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے" یہ کہ کر وہ بھاگا
ہوا اپنی ماں کے پاس گیا۔

" سرگ تم سوتے کیوں نہیں! جاؤ اپنے بستر پر جا لیٹو" ماں نے
نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا۔

" امّی! جب دیکھو بازار میں آگ جل رہی ہے۔ مجھے اِس بات
سے ڈر لگتا ہے"

" جاؤ سرگ اپنے بستر پر جا لیٹو ـــــ یہ آگ والے کچھ
بھی نہیں ـــــ کاش! تمہارے ابا یہاں موجود ہوتے"

امّی ـــــ"

" ہاں! میرے بچے"

" میں آپ کے پاس آ جاؤں ؟ ـــــ مجھے ڈر لگ رہا ہے"

" کس سے ؟ میرے جگر کے ٹکڑے"

" جادوگر سے امّی"

" وہ کونسا جادوگر"

" بہت سے جادوگر ہیں امّی ـــــ مختلف قسم کے جادوگر"

" تو پھر میرے پاس آ جاؤ"

" سرگ خوشی خوشی اپنی ماں کے پاس جا لیٹا۔ اور اپنے آپ کو
لحاف میں چھپا کر کہنے لگا" امّی یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں"
اس کی ماں تو تھوڑی دیر کے بعد ہی سو گئی۔ مگر سرگ لحاف سے
منہ نکال کر سوچنے لگا۔ کہ آیا وہ شخص بُرے ہیں یا اچھے۔ مگر کوئی قابل
اطمینان نتیجہ نہ نکال سکا۔

دوسرے روز صبح کو جب سرگ کو ناشتہ ملا۔ تو اُس کی حیرانی
کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب گرم گرم بسکٹوں کی بجائے اِس نے میز
پر سخت اور ٹھنڈی روٹی کے ٹکڑے دیکھے۔

"مجھے بسکٹ لا کر دو؟ میں ایسی فضول چیز نہیں کھانے کا ——— تم بسکٹ کیوں نہیں لاتے؟"

سرگ نے خشک روٹی کے ٹکڑوں کو میز سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ننھے آقا! آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے۔ کہ ہمارے ہاں یہ خشک روٹی بھی موجود ہے" نوکر نے سرگ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ جاؤ جاؤ یہ اٹھالو ——— اُمی! اُمی! مجھے بسکٹ لا کر دو"

"سرگ پیارے! میں تمہیں بسکٹ کہاں سے لا کر دوں ——— بسکٹ بنانے والے کارخانے ہی بند ہیں۔

"وہ کیوں؟؟"

"کارخانے کے مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے"

پھر وہی مزدور! سرگ اِن مزدوروں کی حرکت سے تنگ آگیا تھا تنگ آکر بولا" مگر بسکٹوں کے بغیر صبح کا ناشتہ کیسے ہوگا؟"

"ہم تمہارے بسکٹوں کے لئے کوشش کریں گے"

"کیا گورنر انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ کہ وہ بسکٹ تیار کریں"

"سرگ پیارے! گورنر بیچارہ کیا کرے۔ وہ تو کسی کا حکم نہیں

مانتے"

"گورنر کا بھی؟"

"گورنر کیا کسی کا بھی حکم نہیں مانتے"

"تو پھر وہ گورنر سے بھی بڑے ہوئے نا!"

"سرگ اِن باتوں کو چھوڑو۔ اور خدا کا شکر کر کے یہی روٹی کھالو"

"ہیں تو ایسی بھدی روٹی نہیں کھانے کا"

"مگر تمہیں مجبوراً کھانی پڑے گی"

"وہ کیوں؟"

سرگ کی حیرانی لحظہ بہ لحظہ اور روز بروز بڑھتی چلی گئی وہ سخت حیران تھا۔ کہ وہ لوگ جو کارخانوں کو چشم زدن میں بند کر سکتے ہیں۔ جو گورنر تک کا حکم نہیں مانتے۔ پولیس سے اِس طرح کیوں کر بھاگے پھرتے ہیں۔

اُس نے خیال کیا۔ کہ یہ لوگ ویسے ہی جادوگر ہیں۔ جن کا حال میں عموماً کہانیوں میں پڑھا کرتا ہوں۔ اور یہ کہ اُن کے پاس بھی

اُن جادوگروں کی طرح ایسی ٹوپیاں ہوں گی۔ جن کے پہننے سے وہ
غائب ہو جاتے ہوں گے۔

جب گورنر اُن سے کام کو کہتا ہوگا۔ تو وہ جھٹ ٹوپی پہن گورنر
کی آنکھوں سے غائب ہو جاتے ہوں گے۔

بے چینی کی لہر آہستہ آہستہ بازاروں میں سے ہوتی ہوئی اُن
سربفلک محلات میں بھی داخل ہو گئی۔ جن کے ساکنوں نے آج
تک مصیبت اور تکلیف کا نام تک نہ سنا تھا۔

اب اُن محلوں میں وہ پہلی سی شان وشوکت نہ رہی۔ خوشی
کے نغمے اور قہقہے جن سے اُنکی دیواریں ہمیشہ گونجا کرتی تھیں ——
آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ اب اُن کی جگہ ایک نامعلوم خوف نے
لے لی۔ وہ جن کے کان خوف سے بالکل ناآشنا تھے۔ اب ہر وقت
کسی نامعلوم خوف سے ہراساں رہنے لگے۔ وہ شخص جو ناز و نعمت
کے عادی تھے۔ اب مجبوراً روکھی سوکھی روٹی پر گزارہ کرنے لگے۔ ایسے
افراد میں سرگئی کی والدہ کا بھی شمار تھا۔

ایک روز شام کے قریب سرگئی کے گھر میں بجلی کی رو بند ہو گئی

سرگئی نے اپنی والدہ سے کہا "امّی! معلوم ہوتا ہے۔ بجلی گھر کا انجن
خراب ہو گیا ہے"

"ملاقات کے کمرے کا لیمپ تو جلا کر دیکھو"

"امّی! اُس کمرے کا کیا، کوئی لیمپ بھی نہیں جلتا"

"کیا بجلی گھر میں بھی تو ہڑتال نہیں ہو گئی؟"

خادم آگنیش نے کہا "جی ہاں! میں نے سنا ہے کہ بجلی گھر والوں
نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے"

"آگنیش! دیکھو گھر میں موم بتیاں ہیں؟"

"جی ہیں! مگر بہت تھوڑی"

اب اُس گھر میں جو بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنا ہوتا تھا ——
تاریکی —— قیامت کی تاریکی مسلّط تھی —— ہال میں بجلی
کے قمقموں کے بجائے موم بتی کی زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اس روشنی
کے گرد سرگئی اور اُس ماں دونوں بیٹھے دن کے واقعات پر غور کر رہے
تھے۔ کہ باورچی خانہ سے خدام تازہ خبر لائے۔ کہ تھوڑے دنوں کے
بعد نلوں میں پانی آنا اور گوشت بکنا بھی بند ہو جائے گا۔

سرگئی اِن ہوشربا خبروں کو حیرت واستعجاب کی تصویر بنا ہوا سن رہا تھا ۔ اب اِس کے ننھے دماغ میں یہ خیال پوری طرح مسلّط ہوگیا۔ کہ مزدور لوگ ضرور جادوگر ہیں ——— بہت بڑے جادوگر جو صرف الٰہ دین کے چراغ ہی سے مطیع ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ جادوگر چاہیں۔ تو ایک اشارے سے ریل گاڑیاں چلنی شروع ہو سکتی ہیں ، اِس کا باپ فوراً گھر آسکتا ہے۔ اُن کے حکم سے بجلی کی رو پھر واپس آسکتی ہے ۔ اور کمرے پہلے کی طرح پھر جگمگا سکتے ہیں۔ اور اگر وہ چاہیں۔ تو اسے ہر روز صبح ناشتے کے ساتھ گرم اور تازہ توش مل سکتے ہیں۔

سرگئی اِس بات کا متوقع بھی نہ تھا۔ جب پندرہ دن کے بعد ایک دِن یک لخت معجزے رونما ہوئے۔ یعنی ٹریم کاریں چلنی شروع ہوگئیں ، بجلی کی رو آگئی ، اخباروں کی اشاعت از سرِ نو جاری ہوگئی ، صبح ناشتہ کے ساتھ توش ملنے لگ گئے۔ اور اُس کا باپ گھر آگیا ——— غرضیکہ اتنی اچھی باتیں بیک وقت ہوگئیں۔

ایک روز جب وہ اپنے آبا کے ساتھ بازاروں میں گھومنے کے لئے گیا۔ تو اِس نے خلاف توقع بہت سے "جادوگروں" کو آزادانہ چلتے پھرتے دیکھا۔ جو ہاتھ میں جھنڈے پکڑے مختلف قسم کے راگ گاتے ہوئے بازاروں میں چکر لگا رہے تھے ۔ وہ اب کسی سے خوفزدہ نہ تھے ۔ اور نہ اب پولیس ہی انہیں ایسا کرنے سے روک رہی تھی جب سرگئی گھر واپس آیا تو اِس نے چاہا۔ کہ اب کی دفعہ اکیلا بازار میں جاکر اُن "جادوگروں" کا تماشہ دیکھے ۔

"امّی ——— میری پیاری امّی ! بازار میں جادوگر گزر رہے ہیں۔ کیا میں انہیں دیکھنے جاؤں ؟"

"ہرگز نہیں ؟"

"امّی ! اب تو وہ بُرے نہیں ۔

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے ——— اب پہلے کی طرح امن تھا کسی قسم کی شورش یا ہڑتال رونما نہ ہوئی ، گھروں میں پھر خوشی کے نغمے اور قہقہے گونجنے لگے ۔ اور وہ نامعلوم خوف جو لوگوں کے دلوں پر مسلّط ہوگیا تھا ۔ رفتہ رفتہ بالکل غائب ہوگیا۔

ایک روز سرگت بڑا اُداس ہوگیا ـــــــ اِس کی ماں اور باپ دونوں تھیٹر گئے ہوئے تھے۔ گھر کی خادمہ کسی کام میں مشغول تھی اور اس کی بہن اپنی گڑیوں میں کھیل رہی تھی۔ سرگت حیران و پریشان ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا۔ کہ وقت کاٹنے کے لئے کیا کرے۔

" دادی اماں! بتائیے میں کیا کروں "

" آؤ میرے پاؤں دباؤ "

" میں نہیں دباتا ـــــــ پاؤں دبانے میں کوئی دلچسپی نہیں "

یہ کہ کر وہ اسی خیال میں مستغرق دوسرے کمرے میں گیا۔ اور اپنی بہن کی نئی گڑیا توڑ ڈالی۔ اِس حرکت پر ماما سخت خفا ہوئی اور اس نے اُسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اب وہ چاہتا تھا۔ کہ باورچی خانہ میں جا کر نئی باورچن کو دیکھے مگر خادمہ اجازت نہ دیتی تھی۔ اِسلئے کہ سرگت کی ماں اِس سے کہ گئی تھی۔ کہ اُسے باورچی خانہ میں ہرگز ہرگز نہ جانے دے۔

سرگت نے تنگ آ کر کہا "مگر میں کیا کروں ـــــــ میں

اکیلا ہوں "

" خادمہ نے سرگت سے پوچھا" کیا تمہارے لئے کوئی اور دلچسپی باقی نہیں رہی؟"

" یہ کون باتیں کر رہا ہے؟"

" باورچن کا خاوند آیا ہوا ہے۔ وہی باتیں کرتا ہوگا "

" یہ دلچسپ چیز نہیں تو اور کیا ہے؟ "

" وہ دلچسپ کس طرح ہوا ـــــــ وہ معمولی سا آدمی ہے ـــــــ ایک غریب مزدور "

" باورچن کا خاوند ایک مزدور "

" کیوں "

" ایک جادوگر ـــــــ اب تو میں ضرور اندر جاؤنگا "

" سرگت! اگر تمنے ایسا کیا تو میں تمہاری اماں سے کہ دوں گی کہ تم نے اُن کی نافرمانی کی ہے "

" تم چغل خور بھی ہو؟ ـــــــ چغل خور! کہ کر تو دیکھو۔ میں نے بھی انہیں بتا نہ دیا ہو۔ کہ تم نے صبح دودھ پر سے بالائی اتار کر کھالی تھی

"یہ بالکل غلط ہے ——— میں نے تو دودھ میں سے مکھی نکالی تھی"

سرگئی بہت عرصے تک خادمہ سے جھگڑتا رہا۔ مگر اُس نے اُسے باورچی خانے میں جانے کی اجازت نہ دی۔

جب خادمہ کمرے سے چلی گئی۔ تو سرگئی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور باورچی خانے کے دروازے کے قریب جاکر اُسے آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا۔ سرگئی میں اتنی ہمت نہ تھی۔ کہ دروازہ ایک دم کھول دے۔ اِس لئے وہ کچھ عرصہ سانس بند کئے۔ دروازے کے ساتھ لگا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمت کر کے اُس نے کمرے کے اندر جھانکا ——— ایک بھدا سا آدمی میز پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ اس کی حرکت سے معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ ڈر رہا ہے۔ کہ کوئی شخص اُس کا کھانا نہ چھین لے۔ اِسی لئے وہ دوسرے ہاتھ سے پلیٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

سرگئی حیران تھا۔ کہ وہ "جادوگر" کہاں ہے؟ ——— ایسا بھدا مزدور اتنا طاقتور جادوگر نہ ہو سکتا تھا۔

اُس نے باورچی خانے کے ہر گوشہ میں نگاہیں دوڑائیں۔ مگر اُس شخص اور باورچن کے سوا کسی اور کو موجود نہ پایا ——— تو پھر اس کے یہ معنی تھے۔ کہ وہ بدنما شخص ہی جادوگر ہے۔ سرگئی اِس راز کو معلوم کرنے کے لئے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ جس پر "جادوگر" اِس قدر چونکا۔ کہ اِس کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔

باورچن نے اپنے خاوند کو تسلی دیتے ہوئے کہا "تم کھانا کھائے چلو ——— ننھے آقا تمہیں کچھ نہیں کہینگے"

"سرگئی نے حیران ہو کر پوچھا" ہیں؟"

"اپنی اُمّی سے مت کہئے۔ کہ یہ شخص شوربا پی رہا تھا ——— یہ کھانے سے بچا ہوا تھا۔ ننھے آقا"

"یہ شخص بہت بھوکا ہے۔ ننھے آقا! آپ کو اِس پر رحم کرنا چاہیئے"

"کون؟"

"یہ شخص ——— میرا خاوند"

"تمہارا خاوند؟"

"سرگئی نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی خاطر اُس شخص کو

غور سے دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔ اس جادوگر نے ضرور اپنی شکل
تبدیل کر رکھی ہے"

اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "تم جادوگر ہو ـــــ مجھے اچھی
طرح معلوم ہے۔ تم جادوگر ہو!"

مزدور نے ڈرتے ہوئے پوچھا "کون"

"تم اور کون"

"میں ایک غریب مزدور ہوں میرے آقا!"

"لیکن تم جادوگر ہو ـــــ مجھے یقین ہے۔ کہ تم جادوگر ہو۔ تم
سب کچھ کر سکتے ہو۔ یہ سب حرکتیں تمہاری تھیں۔ لیکن دیکھو!
اب ایسی حرکت نہ کرنا ـــــ بغیر بجلی کے گھر میں سخت اندھیرا
ہو جاتا ہے۔ اور کارخانے بند کرنے سے مجھے بسکٹ نہیں ملتے"

"جناب! میں نے تو ایسی حرکت کبھی نہیں کی ـــــ میں ابھی
جاتا ہوں"

"تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔ تم تو کسی سے خوفزدہ ہی نہیں
ہوتے۔ میرا خیال تھا۔ کہ تم مکان جتنے بڑے ہو گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے

تم نے شکل تبدیل کر رکھی ہے"

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ میرے پاس
کھانے کو کچھ نہیں۔ اس طرح مذاق اڑانا گناہ ہے میرے آقا!"

"میں نے خیال کیا تھا۔ کہ تم بہت سنجیدہ ہو گے۔ مگر معلوم ہوتا
ہے۔ کہ تم مسخرے بھی ہو۔ شوربا پیتے وقت تمہارے ہاتھ کانپ رہے
تھے۔ اس لئے میں تم سے ذرہ بھر خوفزدہ نہیں"

اتنا کہہ کر سرگت باورچی خانہ سے باہر نکل کر دروازہ میں کھڑا ہو
گیا۔ تاکہ اگر جادوگر اس کا تعاقب کرے۔ تو وہ جلدی سے گھر میں بھاگ
جائے۔ مگر خلافِ توقع جادوگر نے اس کا تعاقب نہ کیا۔ سرگت نے مڑ کر
دیکھا تو جادوگر ـــــ ہاں! وہی جادوگر۔ ایک کونے میں کھڑا رو رہا
تھا۔ اور اپنے آنسوؤں کو اپنی غلیظ آستین سے صاف کر رہا تھا۔

"ایک جادوگر ہو کر تم رو رہے ہو۔ اچھا ہوا تمہیں ایسی ہی سزا ملنی
چاہیئے۔ تم نے میرے آبا کو گھر میں کیوں نہ آنے دیا تھا؟ ـــــ تم
نے بجلی کی رو کیوں بند کر دی تھی؟ تم نے میرے بسکٹ بنانے کیوں
بند کر دے تھے؟ ـــــ اب تمہیں خدا نے خوب سزا دی ہے۔ روؤ!

—— اور خوب روؤ —— "

یہ کہہ کر سرگت خوشی کے نعرے مارتا ہوا گھر میں چلا گیا۔ اور خادمہ کے پاس جا کر کہنے لگا "اب میں اِس جادوگر سے نہیں ڈرتا —— ذرّہ بھر نہیں ڈرتا" ——

(چریکوف)

"ماہی گیر"

(فرانسیسی شاعر وکٹر ہیوگو کی ایک نظم کے تاثرات)

سمندر رو رہا تھا۔ مقیّد لہریں پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ وزاری کر رہی تھیں، دور پانی کی رقصاں سطح پر چند کشتیاں اپنے دھندلے اور کمزور بادبانوں کے سہارے بے پناہ سردی میں ٹھٹھری ہوئی کانپ رہی تھیں آسمان کی نیلی قبا میں چاند کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ ستاروں کا کھیت اپنے پورے جوبن میں لہلہا رہا تھا —— فضا سمندر کے نمکین پانی کی تیز بُو میں بسی ہوئی تھی۔

ساحل سے کچھ فاصلے پر چند شکستہ جھونپڑیاں خاموش زبان میں ایک دوسرے سے اپنی خستہ حالی کا تذکرہ کر رہی تھیں —— یہ ماہی گیروں کے سر چھپانے کی جگہیں تھیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ جس میں سے چاند کی چند آوارہ شعاعیں زمین پر رینگ رینگ کر اُس کی کاجل ایسی فضا کو نیم روشن کر رہی تھیں۔ اِس اندھی روشنی میں دیوار پر ماہی گیر کا جال نظر آرہا تھا اور

ایک چوبی تختے پر چند تھالیاں جھلملا رہی تھیں۔

جھونپڑی کے کونے میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی تاریک چادروں میں ملبوس اندھیرے میں سر لٹکائے ہوئے تھی۔ اس کے پہلو میں پھٹے ہوئے ٹاٹ پر پانچ بچے محو خواب تھے ——— ننھی روحوں کا ایک گھونسلا جو خوابوں سے تھرتھرا رہا تھا۔ پاس ہی اُن کی ماں نہ معلوم کن خیالات میں مستغرق گھٹنوں کے بل بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

یکایک وہ لہروں کا شور سن کر چونکی ——— بوڑھا سمندر کسی آنے والے خطرے سے آگاہ سیاہ چٹانوں، تند ہواؤں اور نصف شب کی تاریکی کو مخاطب کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ اٹھی اور بچوں کے پاس جا کر ہر ایک کی پیشانی پر اپنے سرد لبوں سے بوسہ دیا اور وہیں ٹاٹ کے ایک کونے پر بیٹھ کر دعا مانگنے میں مصروف ہو گئی۔

لہروں کے شور میں یہ الفاظ بخوبی سنائی دے رہے تھے:۔

"اے خدا! ——— اے بیکسوں اور غریبوں کے خدا، اِن بچوں کا واحد سہارا، رات کا تاریک کفن اوڑھے سمندر کی لہروں کے ساتھ کھیل رہا ہے ——— موت کے عمیق گڑھے میں پاؤں لٹکائے

ہے۔ صرف اِن کی خاطر وہ ہر روز اِس دیو کے ساتھ کشتی لڑتا ہے ——— اے خدا! تو اس کی جان حفاظت میں رکھیو ——— آہ اگر یہ صرف نوجوان ہوتے ——— اگر یہ صرف اپنے والد کی مدد کر سکتے!!"

یہ کہ کر خدا معلوم اُسے کیا خیال آیا۔ کہ وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے تھرتھرائی آواز میں کہنے لگی "بڑے ہو کر اُن کا بھی یہی شغل ہوگا، پھر مجھے چھ جانوں کا خدشہ لاحق رہے گا ——— آہ کچھ سمجھ نہیں آتا، غربت! غربت!!"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی غربت اور تنگ دامانی کے خیالات میں غرق ہو گئی۔ دفعتاً وہ اِس اندھیرے خواب سے بیدار ہوئی۔ اِس کے دماغ میں ہوٹلوں کی دیو قامت عمارتیں اور امرأ کے راحت کدوں کی تصویریں کھنچ گئیں۔ ان عمارتوں کی دلفریب راحتوں اور امرأ کی تعیش پرستیوں کا خیال آتے ہی اُس کے دل پر ایک دھند سی چھا گئی۔ پیچھے پر کسی غیر مرئی ہاتھ کی گرفت محسوس کر کے وہ جلدی سے اٹھی۔ اور [illegible] سے تاریکی میں آوارہ نظروں سے دیکھنے

شروع کر دیا۔

اُس کی یہ حرکت خیالات کی آمد کو نہ روک سکی۔ وہ سخت حیران تھی۔ کہ لوگ امیر اور غریب کیوں ہوتے ہیں۔ جبکہ ہر انسان ایک ہی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اِس سوال کے حل کے لئے اُس نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا۔ مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔ ایک اور چیز جو اُسے پریشان کر رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ جب اُس کا خاوند اپنی جان پر کھیل کر سمندر کی گود سے مچھلیاں چھین کر لاتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ مارکیٹ کا مالک بغیر محنت کئے ہر روز سینکڑوں روپئے پیدا کر لیتا ہے۔ اُسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ محنت تو کریں۔ ماہی گیر اور نفع ہو مارکیٹ کے مالک کو۔ رات بھر اُس کا خاوند اپنا خون پسینا ایک کر دے۔ اور صبح کے وقت آدھی کمائی اُس کی بڑی توند میں چلی جائے ــــــ اِن تمام سوالوں کا کچھ جواب نہ پا کر وہ ہنس پڑی اور بلند آواز میں کہنے لگی۔

" مجھ بے عقل کو بھلا کیا معلوم ہو۔ یہ سب خدا جانتا ہے مگر ــــــ "

اِس کے بعد وہ کچھ کہنے والی تھی کہ کانپ اُٹھی " اے خدا میں گناہگار ہوں

تو جو کرتا ہے۔ بہتر کرتا ہے ــــــ ایسا خیال کرنا کفر ہے "

یہ کہتی ہوئی وہ خاموشی سے اپنے بچوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور اُن کے معصوم چہروں کی طرف دیکھ کر بے اختیار رونا شروع کر دیا۔

باہر آسمان پر کالے بادل مہیب ڈائنوں کی صورت میں اپنے سیاہ بال پریشان کئے چکر کاٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی اگر کوئی بادل کا ٹکڑہ چاند کے درخشاں رخسار پر اپنی سیاہی مل دیتا تو فضا پر قبر کی تاریکی چھا جاتی سمندر کی سیمیں لہریں گہرے رنگ کی چادر اوڑھ لیتیں۔ اور کشتیوں کے مستولوں پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اچانک تبدیلی کو دیکھ کر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیتیں۔

ماہی گیر کی بیوی نے اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کئے۔ اور دروازے کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ کہ آیا دن طلوع ہوا ہے یا نہیں کیونکہ اسکا خاوند طلوع کی پہلی کرن کے ساتھ ہی گھر واپس آجایا کرتا ہے۔ مگر صبح کا ایک سانس بھی بیدار نہ ہوا تھا۔ سمندر کی تاریک سطح پر روشنی کی ایک دھاری بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ بارش کا جل کی طرح تمام فضا پر برس رہی تھی ــــــ بوڑھا سمندر کھانس رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک دروازے کے پاس کھڑی اپنے خاوند کے خیال میں مستغرق رہی، جو اس بارش میں اور سمندر کی تند موجوں کے مقابلے میں لکڑی کے ایک معمولی تختے اور کمزور بادبان سے مسلح تھا۔ وہ ابھی اس کی عافیت کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔ کہ یکایک اس کی نگاہیں گہرے اندھیرے میں ایک شکستہ جھونپڑی کے سائے کی طرف اٹھیں۔ جو تاروں سے محروم آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے لرز رہا تھا۔

اس جھونپڑی میں روشنی کا نام تک نہ تھا۔ کمزور دروازہ کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تنکوں کی چھت ہوا کے دباؤ تلے دوہری ہو رہی تھی۔

"آہ! خدا معلوم بیچاری بیوہ کا کیا حال ہے ——— اُسے کئی روز سے بخار آ رہا ہے!" ماہی گیر کی بیوی زیر لب گنگنائی اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید کسی روز وہ بھی اپنے خاوند سے محروم ہو جائے، کانپ اٹھی"

وہ شکستہ جھونپڑی ایک بیوہ کی تھی۔ جو اپنے دو کم سن بچوں سمیت

روٹی کے قحط میں اپنی موت کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔ مصیبت کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اُس پر کوئی سایہ کرنے والا نہ تھا۔ رہا سہا دو ننھے بچے تھے۔ جو ابھی مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔

ماہی گیر کی بیوی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ اُمڈا ——— بارش کے بچاؤ کے لئے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑہ رکھ کر اور ایک اندھی لالٹین روشن کرنے کے بعد وہ جھونپڑی کے پاس پہنچی۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی ——— لہروں کا شور اور تیز ہواؤں کی چیخ پکار اس کا جواب تھی۔ وہ کانپی اور خیال کیا۔ کہ شاید اُس کی اچھی ہمسائی گہری نیند سو رہی ہے۔

اُس نے ایک بار پھر آواز دی، دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر جواب پھر خاموشی تھا ——— کوئی صدا، کوئی جواب اُس جھونپڑی کے بوسیدہ لبوں پر نمودار نہ ہوا۔ لکایک دروازہ، جیسے اس بے جان چیز نے رحم کی لہر محسوس کی ہو، متحرک ہوا۔ اور کھل گیا۔

ماہی گیر کی بیوی جھونپڑی کے اندر داخل ہوئی۔ اور اُس خاموش قبر کو اندھی لالٹین سے روشن کر دیا۔ جس میں لہروں کے

شور کے سوا مکمل سکوت طاری تھا، پتلی چھت سے بارش کے قطرے بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں سیاہ زمین کو تر کر رہے تھے ——— فضا میں ایک مہیب خوف سانس لے رہا تھا۔

ماہی گیر کی بیوی اِس خوفناک سماں کو دیکھ کر جو جھونپڑی کی چار دیواری میں سمٹا ہوا تھا۔ سرتاپا ارتعاش بن کر رہ گئی۔ آنکھوں میں گرم گرم آنسو چھلکے اور بے اختیار اچھل کر بارش کے ٹپکے ہوئے قطروں کے ساتھ ہم آغوش ہو گئے۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور دردناک آواز میں کہنے لگی :-

"آہ! ——— تو اُن بوسوں کا جو جسم کو راحت بخشتے ہیں۔ ماں کی عبادت، گیت، تبسم، محبت اُن فلک بوس عمارتوں کا جو ہماری طرف اپنی بیسیوں منور آنکھوں سے دیکھا کرتی ہیں، ہنسی اور ناچ کا ایک ہی انجام ہے ——— یعنی قبر! ——— آہ، میرے خدا!"

اِس کے سامنے پھوس کے بستر پر بیوہ کی سرد لاش اکڑی ہوئی تھی اور اُس کے پہلو میں دو بچے محو خواب تھے۔ لاش کے سینے میں ایک آہ کچھ کہنے کو رُکی ہوئی تھی، اس کی پتھرائی آنکھیں جھونپڑی کی خستہ چھت

کو چیر کر تاروں سے محروم آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں، جیسے انہیں کچھ پیغام دینا ہو۔

ماہی گیر کی بیوی اِس وحشت خیز منظر کو دیکھ کر چلّا اٹھی۔ تھوڑی دیر دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومی۔ یکایک اُس کی نمناک آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ اور لپک کر لاش کے پہلو سے کچھ چیز اٹھا کر اپنی چادر میں لپیٹ لی۔ اور اُس دار لخطر سے لڑکھڑاتی ہوئی اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگ نکلی۔

چہرے کے بدلے ہوئے رنگ اور لرزاں ہاتھوں سے اُس نے اپنی جھولی کو میلے بستر پر خالی کر دیا۔ اور اُس پر پھٹی ہوئی چادر ڈال دی۔ تھوڑی دیر بیوہ سے چھینی ہوئی چیز کی طرف دیکھ کر وہ اپنے بچوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

طلوع سمندر کے افق پر سپید ہو رہا ہے۔ سورج کی دھندلی کرنیں تاریکی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ماہی گیر کی بیوی بیٹھی اپنے احساس جُرم کے شکستہ تار چھیڑ رہی تھی۔ اِن غیر مربوط الفاظ کے ساتھ سنہری لہریں اپنی معصوم تانیں ملا رہی تھیں۔

آہ ماہیں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اگر اب مجھے مارے تو مجھے کوئی شکائت نہ ہوگی —— اور یہ بھی عجیب ہے۔ کہ میں اُس سے خائف ہوں۔ جس سے محبت کرتی ہوں —— کیا واپس چھوڑ آؤں؟ —— نہیں —— شاید وہ معاف کردے"

وہ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ ہوا سے دروازہ ہلا۔ یہ دیکھ کر اُسکا کلیجہ دھک سا رہ گیا۔ اٹھی اور کسی کو نہ پا کر پھر وہیں متفکر بیٹھ گئی۔

"ابھی نہیں —— بیچارہ —— اُسے اِن بچوں کے لئے کتنی تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے —— اکیلے آدمی کو سات پیٹ پالنے پڑتے ہیں اور —— مگر یہ شور کیا ہے؟"

یہ آواز چیختی ہوئی ہوا کی تھی۔ جو جھونپڑی کے ساتھ رگڑ کر گزر رہی تھی "اُس کے قدموں کی چاپ! آہ نہیں، ہوا ہے۔"! یہ کہہ کر وہ پھر اپنے اندرونی غم میں ڈوب گئی۔ اب اُس کے کانوں میں ہواؤں اور لہروں کا شور مفقود ہوگیا —— سینے میں مختلف خیالات کا تصادم کیا کم شور تھا۔

آبی جانور ساحل کے آس پاس چلا رہے تھے، پانی میں گھلے ہوئے سنگریزے ایک دوسرے سے ٹکرا کر کھنکھنا رہے تھے۔ کشتی کے چپوؤں کی آواز صبح کی خاموش فضا کو مرتعش کر رہی تھی ——

ماہی گیر کی بیوی کشتی کی آمد سے بیخبر اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی

دفعتہً دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا —— صبح کی دھندلی شعاعیں جھونپڑی میں تیرتی ہوئی داخل ہوگئیں ساتھ ہی ماہی گیر کا دھولی پر ایک بڑا جال ڈالے دہلیز پر نمودار ہوا۔

اُس کے کپڑے رات کی بارش اور سمندر کے نمکیں پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ آنکھیں کم خوابی کی وجہ سے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جسم سردی اور غیر معمولی مشقت سے اکڑا ہوا تھا۔

"نسیم کے ابا، تم ہو!" ماہی گیر کی بیوی چونک اُٹھی۔ اور عاشقانہ بیتابی سے اپنے خاوند کو چھاتی سے لگا لیا۔

"ہاں، میں ہوں پیاری"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر کے کشادہ مگر مغموم چہرے پر مسرت کی ایک دھندلی روشنی چھا گئی، وہ مسکرایا —— بیوی کی محبت نے

اُس کے دل سے رات کی کلفت کا خیال محو کر دیتا تھا۔

"موسم کیسا تھا؟" بیوی نے محبت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"ٹھنڈ!"

"مچھلیاں ہاتھ آئیں؟"

"بہت کم! ــــ آج رات تو سمندر قزاقوں کے گروہ کے مانند تھا"

یہ سن کر اُس کی بیوی کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ ماہی گیر نے اُسے مغموم دیکھا اور مسکرا کر بولا:

"تو میرے پہلو میں ہے ــــ میرا دل خوش ہے"

"ہوا تو بہت تیز ہوگی؟"

"بہت تیز، معلوم ہو رہا تھا۔ کہ دنیا کے تمام شیطان مل کر اپنے منحوس پر پھڑپھڑا رہے ہیں ــــ جال ٹوٹ گیا، رسیاں کٹ گئیں۔ اور کشتی کا بھی تو ٹوٹتے ٹوٹتے بچا" پھر اس گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے "مگر تم شب بھر کیا کرتی رہی ہو پیاری؟"

بیوی کسی چیز کا خیال کرکے کانپی اور لرزاں آواز میں جواب دیا:

"ہیں! ــــ آہ کچھ بھی نہیں ــــ سینتی پرونی رہی، تمہاری راہ تکتی رہی ــــ لہریں بجلی کی طرح کڑک رہی تھیں ــــ مجھے سخت ڈر لگ رہا تھا"

"ڈر! ــــ ہم لوگوں کو ڈر کس بات کا ــــ"

"اور ہاں، ہماری ہمسایہ بیوہ مر گئی ہے" بیوی نے اپنے خاوند کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ماہی گیر نے یہ دردناک خبر سنی۔ مگر اُسے کچھ تعجب نہ ہوا، شاید اِس لئے کہ وہ ہر گھڑی اِس عورت کی موت کی خبر سننے کا متوقع تھا اُس نے آہ بھری اور صرف اتنا کہا" بیچاری سدھار گئی!"

"ہاں دو بچے چھوڑ گئی ہے۔ جو لاش کے پاس لیٹے ہوئے ہیں"

یہ سن کر ماہی گیر کا جسم زور سے کانپا اور اُس کی صورت سنجیدہ و متفکر ہوگئی۔ ایک کونے میں اپنی اونی ٹوپی، جو پانی سے بھیگ رہی تھی۔ پھینک کر سر کھجلانا شروع کر دیا۔ اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنے آپ سے بولا:

پانچ بچے تھے" اب سات ہوگئے ــــ اِس سے پیشتر ہی

اِس تند موسم میں ہمیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا ——— اب! مگر، خیر ——— یہ میرا قصور نہیں، اِس قسم کے حوادث بہت گہرے معانی رکھتے ہیں"

وہ کچھ عرصے تک اِسی طرح اپنا سر گھٹنوں میں دبائے سوچتا رہا۔ اُسے یہ سمجھ نہ آتا تھا۔ کہ خدا نے اِن بچّوں سے جو اُس کی مٹھی کے برابر بھی نہیں ماں کیوں چھین لی ہے؟ ——— اُن بچّوں سے جو نہ کام کر سکتے ہیں۔ اُس کا دماغ اِن سوالوں کا کوئی حل نہ پیش کر سکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔

"شاید ایسی چیزوں کو ایک عالم ہی سمجھ سکتا ہے" اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر بولا "پیاری جاؤ انہیں یہاں لے آؤ، وہ کس قدر وحشت زدہ ہوں گے۔ اگر صبح اپنی ماں کی لاش کے پاس بیدار ہوئے۔ اُن کی ماں کی روح سخت بے قرار ہوگی ——— جاؤ، بھی لے آؤ"

یہ کہہ کر وہ دل میں سوچنے لگا۔ کہ وہ اُن بچّوں کو اپنی اولاد کی طرح پالے گا۔ وہ بڑے ہو کر اُس کے گھٹنوں پر چڑھنا سیکھ جائیں گے۔ خدا اُن اجنبیوں کو جھونپڑی میں دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ اور انہیں

زیادہ کھانے کو عطا کرے گا۔

"تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ پیاری! ——— میں زیادہ محنت سے کام کروں گا" اور پھر اپنی بیوی کو چارپائی کی طرف روانہ ہوتے دیکھ کر بلند آواز میں کہنے لگا "مگر تم سوچ کیا رہی ہو ——— اِس دھیمی چال سے نہیں چلنا چاہیئے تمہیں"

ماہی گیر کی بیوی نے چارپائی کے پاس پہنچ کر چادر کو الٹ دیا "وہ تو یہ ہیں!" دو بچے صبح کی طرح مسکرا رہے تھے۔

"تماشا"

طبعزاد

"تماشا"

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں، سُرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونین حادثہ کا پیغام لا رہی تھیں سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبت ناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو آج سے کچھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجوم سے پُر ہوا کرتے تھے۔ اب کسی نامعلوم خوف کی وجہ سے سونے پڑے تھے ——— شہر کی فضا پر ایک پُراسرار خاموشی مسلّط تھی ——— بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد گھر کی خاموش اور پُرسکون فضا سے سہما ہوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابا! آپ مجھے سکول کیوں نہیں جانے دیتے؟"

"بیٹا! آج سکول میں چھٹی ہے"

"ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتلایا ہی نہیں۔ وہ تو کل کہ رہے تھے

که جو لڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھائے گا۔ اُسے سخت سزا دی جائے گی؟"

"وہ اطلاع دینی بھول گئے ہونگے"

"آپ کے دفتر میں بھی چھٹی ہے؟"

"ہاں! ہمارا دفتر بھی آج بند ہے"

"چلو اچھا ہوا! آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنونگا"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ تین چار طیارے چیختے ہوئے اُن کے سر سے گزر گئے۔ خالد اِن کو دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا۔ وہ تین چار روز سے اِن طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا۔ مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ وہ حیران تھا۔ کہ یہ جہاز سارا دن دھوپ میں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اُن کی روزانہ نقل و حرکت سے سخت تنگ آ کر بولا۔

"آبا! مجھے اِن جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ اِن کے چلانے والوں سے کہہ دیں۔ کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گزرا کریں؟"

"خوب! ـــــ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد؟"

"آبا یہ جہاز بہت خوفناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے یہ کسی نہ کسی

دن ہمارے گھر پر گولا پھینک دیں گے"

"یہ تم نے کس سے سنا؟"

"کل صبح ماما امی جان سے باتیں کر رہی تھی۔ کہ اِن جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر انہوں نے اس قسم کی شرارت کی تو یاد رکھیں۔ کہ میرے پاس بھی ایک بندوق ہے ـــــ وہی جو آپ نے مجھے پچھلی عید پر لا کر دی تھی۔"

"ماما تو پاگل ہے ـــــ میں اُس سے دریافت کرونگا۔ کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کیا کرتی ہے ـــــ اطمینان رکھو۔ وہ ایسی بات کبھی نہیں کریں گے" خالد کے آبا نے اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنستے ہوئے کہا۔

اپنے والد سے رخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا۔ تاکہ اُس روز جب کہ ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں۔ تو اِس کا نشانہ خطا نہ جائے اور وہ پوری طرح انتقام لے سکے ـــــ کاش! یہی ننھا انتقام ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصہ میں جبکہ ایک کم سن بچہ اپنے انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہوا طرح طرح کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے حصہ میں خالد کا آبا اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا۔ کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرنے پائے جس سے خالد کو دہشت ہو۔ ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دے کر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا ہی رہا تھا۔ کہ خادم ایک دہشتناک خبر لایا کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے۔ کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش ہو کر رہیگا۔

خالد کا آبا یہ خبر سن کر بہت خوفزدہ ہوا۔ اب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ فضا کا غیر معمولی سکون، طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلح پولیس کا گشت، لوگوں کے چہروں پر اداسی کا عالم اور خونین آندھیوں کی آمد کسی خوفناک حادثہ کی پیش خیمہ تھیں ——— وہ حادثہ کس نوعیت کا ہوگا؟"

——— یہ خالد کے آبا کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ مگر پھر بھی

سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہوا تھا۔ باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا آبا کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ طیاروں کی آواز نے اُسے خوفزدہ کر دیا ——— اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سینکڑوں انسان ہم آہنگ آواز میں درد کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیاروں کا شور و غل سن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہوا کمرے سے باہر دوڑ آیا۔ اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ تاکہ وہ جس وقت گولہ پھینکنے لگیں۔ تو وہ اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے انہیں نیچے گرا دے ——— اُس وقت سات سال کے بچے کے چہرہ پر آہنی ارادہ قوی استقلال کے آثار نمایاں تھے۔ جو کم حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں نھامے ایک جرّی سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا ——— معلوم ہو رہا تھا۔ کہ وہ آج اس چیز کو جو اُسے عرصہ سے خوفزدہ کر رہی تھی۔ مٹانے پر تلا ہوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ہی ایک جہاز سے کچھ چیز گری جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مشابہ تھی ——— گرتے ہی وہ ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کی طرح اڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد کے مکان

کی بالائی چھت پر بھی گرے۔ خالد بھاگا ہوا اوپر گیا۔ اور وہ کاغذ اٹھا کر اپنے والد کے پاس لے آیا "آبا جی ——— ماما سچ مچ جھوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے تو گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔

خالد کے آبا نے وہ کاغذ لے کر پڑھنا شروع کیا تو رنگ زرد ہو گیا ——— ہونے والے حادثہ کی تصویر اب اُسے عیاں طور پر نظر آنے لگی۔ اُس اشتہار میں صاف لکھا تھا۔ کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر اُس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا۔ تو نتائج کی ذمہ وار خود رعایا ہو گی۔ اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اس قدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہوئے دریافت کیا "اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا۔ کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے؟"

"خالد! اس وقت تم جاؤ ——— جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو"

"مگر اس میں کیا لکھا ہے؟"

"لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشا ہو گا" خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"تماشا ہو گا! ——— پھر تو ہم بھی چلیں گے نا؟"

"کیا کہا؟"

"کیا اس تماشا میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے؟"

"لے چلیں گے ——— جاؤ! اب کہیں جا کر کھیلو!"

"کہاں کھیلوں؟ ——— بازار میں مجھے آپ جانے نہیں دیتے ماما مجھ سے کھیلتی نہیں، میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا۔ اب آپ ہی بتائیں کھیلوں تو کس سے ——— شام کے وقت تماشا تو ضرور دیکھیں گے؟"

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہوا اپنے والدہ کی نشستگاہ میں چلا گیا جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وہ بازار کا مطالعہ کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے۔ کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں۔ مگر آمد و رفت جاری ہے (لوگ جلسہ میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے) وہ سخت حیران تھا۔ کہ دوکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا۔ مگر

کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نے یہ سوچا۔ کہ لوگوں نے اُس تماشا دیکھنے کی خاطر جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے، دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس خیال نے کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا۔ جس کے لئے تمام بازار بند ہیں۔ خالد کو بے چین کر دیا۔ اب وہ اس وقت کا نہائت بیقراری سے انتظار کرنے لگا۔ جب اس کا آبا اُسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گذرتا گیا ـــــ وہ خونین گھڑی بھی قریب تر آتی گئی سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد اس کا باپ اور ماں تینوں صحن میں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے ـــــ ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔

تڑ ـــ تڑ ـــ تڑ ـــ تڑ . . . .

یہ آواز سنتے ہی خالد کے باپ کے چہرہ کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہوگیا۔ زبان سے بمشکل اس قدر کہہ سکا ـــــ گولی ـــــ۔

خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سنتے ہی اُسے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے خود اس کی چھاتی میں

گولی اتر رہی ہے۔

خالد اس آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا "ابا جی! چلو چلیں۔ تماشا تو شروع ہوگیا ہے"

"کونسا تماشا؟" خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا!

"وہی تماشا جس کے اشتہار آج صبح جہاز بانٹ رہے تھے کھیل تو شروع ہوگیا ہے۔ تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے"

"ابھی بہت وقت باقی ہے ـــــ تم شور مت کرو جاؤ ماما کے پاس جاؤ"

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر وہاں ماما کو نہ پاکر اپنے والد کی نشستگاہ میں چلا گیا اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

بازار آمد و رفت بند ہونے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہے تھے ـــــ دور فاصلہ سے کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی تھوڑا عرصہ گزرنے نہ پایا تھا۔ کہ ان چیخوں میں کسی انسان

کی چیخ پکار بھی شامل ہو گئی۔

خالد اِس آواز کو سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اِس آواز کی جستجو کے لیئے کوشش ہی کر رہا تھا۔ کہ چوک میں اُسے ایک لڑکا دکھائی دیا۔ جو چیختا چلاتا بھاگا چلا آ رہا تھا۔ خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا —— اِس کی پنڈلی پر ایک گہرا زخم تھا۔ جس سے فواروں خون نکل رہا تھا۔

خالد یہ سماں دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوا، بھاگا ہوا اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا "ابا! ابا بازار میں ایک لڑکا گر پڑا ہے۔ جس کی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے"

خالد کا باپ یہ سنتے ہی کھڑکی کی طرف گیا۔ اور دیکھا۔ کہ ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔ بادشاہ کے خوف کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں۔ کہ اُسے سڑک پر سے اٹھا کر سامنے والی دکان کے پھٹے پر لٹا دے۔

بے ساز و برگ افراد کو اٹھانے کے لیئے بادشاہ کی حکومت نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں۔ مگر اِس معصوم بچّے کی لاش جو اُنہی

کی تیغِ ستم کا شکار تھی۔ وہ ننھا پودا جو اُنہی کے ہاتھوں مسلا گیا تھا، وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے اُنہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس گئی تھی، کسی کے دل کی راحت جو اُنہی کے جور و استبداد کے سرد پنجوں نے چھین لی تھی۔ اب اُنہی کی تیار کردہ سڑک پر —— آہ! موت بھیانک ہے۔ مگر ظلم اُس سے کہیں زیادہ خوفناک —— اور بھیانک ہے۔

"ابا! اِس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے؟"

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا جب خالد کمرہ میں اکیلا رہ گیا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ اِس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہوئی ہو گی۔ جبکہ اُسے ایک دفعہ قلمتراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی۔ اور اُس کی والدہ اور والد شب بھر اُس کے سرہانے بیٹھے رہتے تھے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ زخم خود اُس کی پنڈلی میں ہے۔ اور اِس میں شدّت کا درد ہے —— یکلخت وہ رونے لگ گیا۔ خالد کے رونے کی آواز سن کر اُس کی والدہ دوڑی دوڑی

آئی۔ اور اُسے گود میں لے کر پوچھنے لگی۔

"میرے بچّے! رو کیوں رہے ہو؟"

"اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے"

"شرارت کی ہوگی اس نے؟"

اُس نے کہا

قاضی عبدالغفار کی رومان انگیز تصنیف

اُس نے کہا

جو کچھ اُس نے دیکھا۔ زندگی اور موت کے درمیان

اپنے ارمانوں کی بے حساب اولاد۔ اپنے جگر کے

بے شمار ٹکڑے بستی کی گلیوں میں چھوڑتے ہوئے

جہاندیدہ مسافر سفر پر مجبور ہے۔ اور جانے سے

پہلے اپنے مشاہدات بیان کرتا ہے۔ ازحد دلکش

انداز میں۔ . . . . قیمت ۱۲؎

روس کے زندہ جاوید مصنف ٹالسٹائی کا شاہکار

پہلا شراب کار

نیکی اور بدی۔ انسانیت اور شیطنت

کے

درمیان جنگ

شاگردان ابلیس معصومیت پر فتح پانے کے لئے

کیا کیا حیلے بناتے ہیں۔

ازحد دلکش۔ سبق آموز۔ قیمت صرف چار آنے

(محمد یعقوب حسن صاحب دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم ...... صاحب پرنٹر چھپوا کر شائع کیا)

روس کے زندہ جاوید مصنف ٹالسٹائی کا شاہکار

پہلا شراب کار

نیکی اور بدی ۔ انسانیت اور شیطنت

کے

درمیان جنگ

شاگردانِ ابلیس معصومیت پر فتح پانے کے لئے

کیا کیا حیلے بناتے ہیں۔

ازحد دلکش ۔ سبق آموز ۔ قیمت صرف چار آنے

دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ

(لاہور)

(محمد یعقوب حسن صاحب دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم ...)

لیلیٰ کے خطوط و روزنامچہ

بقلم قاضی عبد الغفار

دو عکس ـــــ فطرت انسانی کے ـــــ ایک داستان ہے

"عیش پرست مرد" ظالم کی ایک فریاد ہے غم نصیب "عورت" کی ـــــ

لیلیٰ کے خطوط میں ایک مظلوم عورت کی خونچکاں داستان

پڑھنے کے بعد

"روزنامچہ" میں ایک بے پروا مرد کی فطرت کا مطالعہ کیجئے ۔ مذہب ۔ اخلاق اور تمدن کے باغی کی سرگذشت ۔ اُن لاکھوں مظلوم عورتوں کی روئداد زندگی جو ہندوستان میں ہر سال مردوں کی خواہشات نفسانی پر بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں ۞

قیمت تین روپے آٹھ آنے کی بجائے دو روپے چار آنے

دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور